ماہنامہ

قلندرِ شعور

فروری ۲۰۱۹ء

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

مٹی سے نکلتے ہیں پرندے اڑ کر
دنیا کی فضا دیکھتے ہیں مڑ مڑ کر
مٹی کی کشش سے اب کہاں جائیں گے
مٹی نے انہیں دیکھ لیا ہے مڑ کر

جلد 7 شمارہ 1	فروری 2019ء	جمادی الاول ۔ جمادی الاخریٰ 1440ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

قلندر شعور

کراچی

Neutral Thinking

(اردو ۔ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ۔ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 70 روپے...... سالانہ ہدیہ 950 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 60 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

۳۷ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ______ احمد یار خان نعیمی 10

نعت رسول مقبول ﷺ ______ (لکھنؤ) عرفان صدیقی 11

رباعیات ______ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ 12

آج کی بات ______ مدیر مسئول 14

فقیر کی ڈاک ______ ادارہ 19

نامے میرے نام ______ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ 21

نومبر 2018ء کے سرورق کی تشریح ______ قارئین 24

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ______ ماخوذ 27

آئینۂ دل ______ گلِ نسرین 31

توجہ ______ ع۔ح۔جمیل 41

لاشعوری جہاں ______ (متحدہ عرب امارات) شاہد خان 47

دل میں کھڑکی ______ امام غزالیؒ 51

سانس کا آنا جانا ___؟ ______ (آرکیٹیکٹ) عبدالوحید نظامی 57

شہنشاہ ظرافت ___ ملا دو پیازہ ______ محمد الدین فوق 63

ادھورا ___؟ ______ عابد محمود 67

صحرائے تھر کی ماروی ______ (Ph.D.) ڈاکٹر سعیدہ شفیق میمن 75

تم تن سے آتے ہو ___ میں جان سے ______ (M.A-Mass Comm.) قرۃ العین واسطی 79

ایک لاکھ بہتر ہزار آٹھ سو ساکن تصاویر ___؟ ______ (M.A-Fine Arts) حامد ابراہیم 85

لہسن اور پیاز کی بو ____ نفیسہ شاکر 91

یقین اور بے یقین ____ (M.Sc-Zoology) زاہدہ تبسم 97

اقتباسات ____ قارئین 101

محمود سامی البارودی ____ زینب صدیق 103

مرشد کی باتیں (۲) ____ (M.A-Mass Comm.) عائشہ خان 109

شطرنج کے موجد کا انعام ____ (M.A-Islamic Studies.) مؤلف : نعیم قریشی 113

کمپیوٹر اور املا نویسی ____ علیم احمد 119

زمستانی افسردگی ____ (M.D–Alternative Medicines) محمد سعید انور 124

اللہ میاں کے باغ کے پھول ____

- اولی الالباب بچے ____ ادارہ 126
- ناشکرا بادشاہ ____ (M.A-Sindhi) فرزانہ حق 128
- رنگ برنگ تتلی ____ (M.A-Mass Comm.) سارہ خان 131

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ____ خواجہ شمس الدین عظیمی 135

147 Hazrat Farid al-Din Attar (RA) ____ The Diary of Birds

151 Extracted ____ Prophet Solomon (PBUH)

156 Dr. Naeem Zafar (Ph.D.) ____ The Cycle of Life

158 Roshan Sitara ____ The Art of Meditation

164 Noor Jehan ____ The Life of Baba Qadir (RA)

168 Bibi Anuradha (UAE) ____ The Grain of Sand

172 K. S. Azeemi ____ Message of the Day

احمد یار خان نعیمی

حمد باری تعالیٰ

اے خالق و مالک رب علیٰ، سبحان اللہ سبحان اللہ
تو رب ہے مرا میں بندہ ترا، سبحان اللہ سبحان اللہ

ہم منگتے ہیں تو معطی* ہے، ہم بندے ہیں تو مولیٰ ہے
محتاج ترا ہر شاہ و گدا، سبحان اللہ سبحان اللہ

ہم جرم کریں تو عفو کرے، ہم قہر کریں تو مہر* کرے
گھیرے ہے جہاں کو فضل ترا، سبحان اللہ سبحان اللہ

تو والی ہے ہر بے کس کا، تو حامی ہے ہر بے بس کا
ہر اک کے لئے در تیرا کھلا، سبحان اللہ سبحان اللہ

ہم عیبی ہیں ستار ہے تو، ہم مجرم ہیں غفار ہے تو
بدکاروں پر بھی ایسی عطا، سبحان اللہ سبحان اللہ

یہ سالک مجرم آیا ہے اور خالی جھولی لایا ہے
دے صدقہ رحمتِ عالمؐ کا، سبحان اللہ سبحان اللہ

اے خالق و مالک رب علیٰ، سبحان اللہ سبحان اللہ
تو رب ہے مرا میں بندہ ترا، سبحان اللہ سبحان اللہ

*معطی = عطا کرنے والا * مہر = مہربانی، رحمت

عرفان صدیقی

نعت رسول مقبول ﷺ

جو بھی سورج، چاند، ستارہ، خوش بو، بادِ بہاری ہے
ہر اک اس سرکار کا چاکر، اس در کا درباری ہے

لوگو، تم اس منظر شب کو کاہکشاں بتلاتے ہو
یہ تو ان کی خاک گزر ہے، ان کی گردِ سواری ہے

سر پر بوجھ گناہوں کا اور دل میں آس شفاعت کی
آگے رحمت ان کی، ویسے مجرم تو اقراری ہے

عالم عالم دھوم مچی ہے ان کے لطف و عنایت کی
بستی بستی، صحرا صحرا، فیض کا دریا جاری ہے

بزم وفا صدیقؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ سے روشن ہے
چار ستارے، چاروں پیارے، چار کی آئینہ داری ہے

ان کی ذات پاک سے ٹھہرا ان کا سارا گھرانہ پاک
جس کے لئے تطہیر کی چادر، ان کے رب نے اُتاری ہے

جو بھی سورج، چاند، ستارہ، خوش بو، بادِ بہاری ہے
ہر اک اس سرکار کا چاکر، اس در کا درباری ہے

گل رنگ پیرہن

مے خانہ پہ ہر سمت گھٹا چھائی ہے
ساقی ترے دامن میں بہار آئی ہے
رخ بھی ترا گل رنگ ہے پیراہن بھی
خود بھی مئے گل رنگ تماشائی بھی

’’بے شک جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے‘‘۔ (یونس:۶۲)

زندگی خوشی اور غم کا آمیزہ ہے اور یہ دونوں احساس ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے جلے رہتے ہیں کہ آدمی ان سے خود کو الگ نہیں کرسکتا۔ ماں جب انتہائی درجہ تکلیف سے گزرتی ہے تو اسے مامتا کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ طالب علم کو دس سال کی مشقت کے صلہ میں میٹرک کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے۔ موسم کے تغیر میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ بہار میں سبز لباس پہن کر درختوں کا پتوں سے مزین ہونا، کلیوں کا چٹکنا، پھولوں کا کھلنا، خوش بو کی مہک، گھاس پر شبنم کا موتی بن کر چمکنا، چڑیوں کی چہک، بلبلوں کا نغمہ سرا ہونا، کوئل کی کوک — یہ سب بہار کی رونقیں ہیں اور جب بہار اپنا بچپن جوانی گزار کر بڑھاپے میں داخل ہوتی ہے تو وہ تمام آثار و احوال اپنا مظاہرہ کرتے ہیں جو بڑھاپے کا وصف ہے۔ پتے سوکھ کر گر جاتے ہیں، شاخوں اور تنوں میں جھریاں پڑ جاتی ہیں، پودوں پر پھولوں کی جگہ ڈنٹھل باقی رہ جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ خوش بو ہزاروں پردوں میں چھپ گئی ہے۔

اسی طرح انسانی زندگی میں بھی بہار اور خزاں کے پیمانوں میں ردّ و بدل ہو رہا ہے۔ ہماری دنیا مے خانہ کی طرح ہے۔ جب بہار آتی ہے تو ہر سمت برسات کا موسم محسوس ہوتا ہے، جیسے آسمان پر گھٹا چھا جائے تو دل میں ایسی گدگدی ہوتی ہے کہ آنکھوں میں خمار آجاتا ہے، انگ انگ میں رعنائی جھلکتی ہے، پیراہن میں سے خوش بوئیں پھوٹتی ہیں اور شراب کا پیالہ یعنی زندگی ایسا تماشا بن جاتی ہے جہاں انسان کی کیفیات گم ہو جاتی ہیں۔

غور کریں تو یہ سب مٹی کا کمال ہے۔ یہی مٹی کبھی مے خانہ، کبھی رخِ زیبا بن جاتی ہے۔ یہی مٹی تماشا بن جاتی ہے اور یہی مٹی تماشائی بن جاتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے رباعی میں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ خوشی اور غم کوئی مستقل شے نہیں ہے، یہ آدمی کے اندر کی واردات و کیفیات ہیں اور ان میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ اگر ہم اس قانون سے واقف ہو جائیں اور توجہ خوشی کی طرف مرکوز کر دیں تو ہم محسوس کریں گے کہ ہر سمت گھٹا چھائی ہے اور ہر سمت بہار آئی ہے۔

آج کی بات

ذہن انسانی کی مختلف ساخت ہوتی ہیں جس کو عرف عام میں ذوق، دل چسپی اور طبیعت کا رجحان کہتے ہیں۔ مثلاً ادب، تاریخ، الہام، وحی اور وہ تمام علوم جس میں انسان دل چسپی لیتا ہے۔ جب کوئی ادیب یا فن کار ذہنی ساخت کے مطابق کسی عنوان کا انتخاب کرتا ہے تو وہ باکمال سخن پرداز، شاعر، سیاست دان، وہ علوم جو الوژن پر قائم ہیں اور وہ علوم جو یقینی درجہ رکھتے ہیں مثلاً علم حصولی اور علم حضوری میں صلاحیت کے مطابق نام ور ہو جاتا ہے۔

ذہن کے تین رخ ہیں: گھٹنا

① گھٹنا ② بڑھنا ③ جن مقداروں پر تخلیق ہے، ان میں قائم رہنا۔

گھٹنے اور بڑھنے سے کثرت نظر آتی ہے جب کہ تخلیق جس فطرت پر ہے اس میں تبدیلی نہیں۔ احسن الخالقین اللہ فرماتے ہیں،

''یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (الروم: ۳۰)

ذہن کے جس رخ میں تغیر نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے احسن تقویم فرمایا ہے، دیگر ساخت اسفل سافلین کے درجہ میں آتی ہیں۔ بات نوع آدم کی ہو رہی ہے۔

''احسن'' کے معنی جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب ہے۔ ''تقویم'' کے معنی سیدھا کرنے، درست کرنے، تناسب کے ساتھ بنانے کے ہیں۔ احسن تقویم کا مفہوم اعلیٰ

ساخت یا بہترین توازن کا حامل ہونا ہے۔ یعنی اس ساخت میں اتنی وسعت ہے کہ یہ کائنات کے تخلیقی فارمولوں سے واقف ہوسکتی ہے۔

سمجھنا ضروری ہے کہ توجہ سے ساخت میں تبدیلی کا عمل کیا ہے ــــ؟

شاگرد تصویر کے خدوخال کو طبیعت میں رفتہ رفتہ جذب کرتا ہے۔ طبیعت سے مراد ذہن ہے اور جذب اپنی طبیعت کی نفی کر کے تصویر کے خدوخال کو نمایاں کرنا ہے۔ مشق سے حافظہ میں لکیروں کا تناسب واضح ہوتے ہی تصویر بن جاتی ہے۔ تصویر اگر پہاڑ کی ہے تو استاد نے سکھانے اور شاگرد نے سیکھنے کے لئے اپنے تصور کو مغلوب اور پہاڑ کی ساخت کو غالب کیا ورنہ پہاڑ کا عکس کاغذ پر منتقل نہ ہوتا۔

قانون: جذب ہونا نشان دہی ہے کہ تصویر کا ایک رخ اندر موجود ہے جس کی فریکوئنسی باہر اپنے دوسرے رخ سے ملتی ہے۔ دراصل اندر میں موجود یہ رخ بار بار راہ نمائی کرتا ہے کہ تصویر کیسے بنے گی۔

بظاہر نقش کو ابھارنے میں استاد نے راہ نمائی کی لیکن تصویر کا عکس استاد نے شاگرد کے ذہن میں منتقل نہیں کیا۔ وہ اس کے ذہن میں تصویر کو دیکھ نہیں سکتا جب تک کہ شاگرد اظہار نہ کردے۔ درحقیقت دونوں نے اپنے اندر تصویر دیکھی، استاد نے اپنی طبیعت کے مطابق راہ نمائی کی، شاگرد نے اپنے فہم کے مطابق قبول کیا۔

استاد سے شاگرد کے ذہن میں تصویر منتقل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں ہم باہر دیکھ رہے ہیں۔ اس طریقہ کار میں جس عمل سے شاگرد گزرتا ہے، سکھانے کے لئے استاد کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ علم حصولی (اکتسابی علوم) کی ایک مثال ہے۔

عارف نے نوجوان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا، ''کیا ہوا ــــ؟''

نوجوان نے حیران ہوکر ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر کیفیت کا ادراک ہوتے ہی عرض کیا، ''دل پر دباؤ محسوس ہو رہا ہے۔''

عارف نے ہاتھ پر دباؤ بڑھایا، ''اور گہرائی میں سوچو۔''

نوجوان کی پلک جھپکنا رکی اور چند ثانیے بعد وہ بولا ــــ ''لہریں!''

عارف نے کہا، ''ہاں!'' دباؤ کی مقدار مزید بڑھائی، ''اور اب ــــ؟''

مادی جسم غیر محسوس ہوتے ہی لہروں کی سنسناہٹ ادراک بنی تو نوجوان نے کہا، ''اس سے پہلے لہریں ہاتھ سے ہاتھ میں منتقل ہوتی محسوس ہوئیں اور اب جسم میں پھیل گئی ہیں۔''

عارف نے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے فرمایا، ''یہ علم کی منتقلی ہے!''

•• ——————— ••

علم حضوری سکھانے میں استاد قلم و کاغذ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ اپنے ذہن کے نقوش شاگرد کے ذہن میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیوں کہ وہ لہروں کا علم جانتا ہے۔

لہر کیا ہے ــــ؟ ربط ہے اور ربط فریکوئنسی (تعدد) پر قائم ہے ــــ فریکوئنسی مقداریں ہیں۔ بظاہر مقدار الگ الگ مگر بنیاد مشترک ہے اور وہ روشنی ہے یہی وجہ ہے کہ ظاہر میں الگ ہونے کے باوجود باطن میں ہر مقدار ایک ہے۔

تربیت روحانی استاد بھی کرتا ہے مگر وہ فرد کو شے کے باطن سے متعارف کراتا ہے۔ظاہر سے متعارف کرانے میں اسپیس در اسپیس کی پابندی ہے جب کہ باطن کے تعارف سے اسپیس مغلوب ہوتی ہے۔

•• ——————— ••

ظاہر اور باطن کے فرق اور ان میں اشتراک کو کائناتی ساخت کی مثال سے سمجھیں۔

’’اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، نور پر نور۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہ نمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔‘‘ (النور: ۳۵)

آسمان، زمین، طاق، چراغ، فانوس، موتی، تارا، زیتون، درخت، تیل، شرق، غرب ـــ سب اسپیس در اسپیس ہیں مگر ان سب کا باطن نور ہے اور نور کا خالق رب العالمین اللہ ہے۔ عالمین کو پڑھنے یعنی مشاہدہ کرنے کی دو طرزیں ہیں۔

۱۔ اسپیس در اسپیس پڑھنا

۲۔ نور سے واقف ہو کر پڑھنا

اسپیس در اسپیس پڑھنے سے اسپیس غالب ہوتی ہے۔ فرد ایک کے بعد ایک شے سے اس طرح واقف ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتا ہے۔

اس کے برعکس نور سے واقفیت ہو جائے تو بندہ زمین و آسمان کی تخلیقات سے متعارف ہو جاتا ہے کیوں کہ سب کا باطن نور ہے ـــ اللہ نور السمٰوٰت والارض۔

• • ——————— • •

روحانیت میں سالک کے ذہن کی ساخت تبدیل ہوتی ہے، وہ ساخت جو ماحول کے زیر اثر بنی ہے یعنی ہر شے کو انفرادی تشخص میں دیکھنا۔ وجہ سالک کے ذہن میں اپنا تشخص ہے۔ صوفی محدود ذہن کو تحلیل کر کے لامحدودیت میں داخل کرتا ہے اور سکھاتا ہے کہ فرد بذات خود کچھ نہیں، نظام کا حصہ ہے اور نظام کا قیام قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق ہے۔

وہ یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہم باہر نہیں اندر دیکھتے ہیں اور اندر دیکھنے کو باہر دیکھنا سمجھتے ہیں۔

صوفی تربیت اور نشیب و فراز سے گزار کر اپنا عکس سالک کے ذہن میں منتقل کرتا ہے یہاں تک کہ سالک کا ذہن مغلوب اور استاد کا غالب ہو جاتا ہے۔

صوفی کی تربیت کا منشا یہ ہے کہ سالک اندر کی دنیا سے روشناس ہو جائے۔

خالق کائنات اللہ کا فرمان ہے کہ ہم زندگی موت سے نکالتے ہیں اور موت زندگی سے نکالتے ہیں۔ اس فرمان پر تفکر کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مرنا ختم ہونا نہیں ہے بلکہ امر ہونا ہے۔ مادی جسم ہر وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ہی تو ہے جس کو عرف عام میں بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور بالآخر موت یعنی غائب ہو جانا کہتے ہیں۔

ہم مرنا جس معنی میں بولتے ہیں، وہ موت نہیں ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ آدمی مرتا نہیں، منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ تغیر غیب سے شروع ہوتا ہے اور غیب پر ختم ہو جاتا ہے۔ مفہوم سمجھنے کے لئے یکسوئی کے ساتھ غور کیجئے۔ انشاءاللہ بات سمجھ میں آ جائے گی۔

خواتین و حضرات قارئین! ہم سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ تفکر کیجئے، جو بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لکھ کر بھیج دیجئے۔

اللہ حافظ

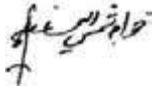

انسانی شعور کی نگاہ کائنات کے ظاہر کو دیکھتی ہے اور انسانی لاشعور کی نگاہ کائنات کے باطن کو دیکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کا لاشعور اچھی طرح جانتا ہے کہ کائنات کے ہر ذرّہ کی شکل وصورت، حرکات اور باطنی حسیات کیا ہیں۔ وہ ان تمام حرکات کو صرف اس لئے نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو اپنے لاشعور کا مطالعہ کرنا نہیں آتا۔ یہ مطالعہ رویا کی صلاحیتیں بیدار کرنے کے بعد ممکن ہے۔

فقیر کی ڈاک

تفکر ــــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ــــ عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ماضی کے اوراق میں سے ایک خط پیش خدمت ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

گزشتہ چار سالوں سے آپ کے مضامین، نظریہ رنگ ونور، مسائل کے حل کے علاوہ دیگر کتب یعنی روحانی نماز، روحانی علاج، ٹیلی پیتھی سیکھئے کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ آپ روحانی علوم کی باقاعدہ اور مسلسل تشریح کرنے کے ساتھ ایسی ایسی باتیں بتاتے ہیں جو میری سمجھ سے بالا لیکن وہ راز ونیاز اور روحانی دنیا کی باتیں ہیں۔ اب تک میں جن روحانی حضرات سے ملا ہوں وہ ان باتوں کے اظہار سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا منع کرنا اور آپ کا اظہار کرنا ــــ ضرور اس کی خاص وجہ ہوگی۔

آپ کے بصیرت افروز مضامین سے جو تھوڑا بہت میں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ ہر شے کی بنیاد امر ہے، جو روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ روشنی ــــ معین مقداریں ہیں، ان سے علم حاصل کر کے انسان روح سے واقف ہوتا ہے اور زندگی کے مقصد کو پالیتا ہے۔

کتاب ''ٹیلی پیتھی سیکھئے'' میں نمک اور مٹھاس پر طویل اور بصیرت افروز مضمون سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ رسول اللہؐ محسن انسانیت اور روحانیت کے سرچشمہ ہیں اور آج یا بعد میں جو صاحبان اس راہ کے مسافر ہوں گے سب آپؐ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ حضور پاکؐ کو شہد کتنا پسند تھا۔ شفایابی کے بارے میں کس قدر ارشادات فرمائے ہیں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ جب مٹھاس شعوری قوتوں کو ترقی دیتی ہے اور نمک لاشعوری قوتوں کو تو پھر نبی کریمؐ کے ارشادات میں شہد کے استعمال میں کیا حکمت ہے؟

شکریہ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ــــ محمد اعجاز خان ایڈوکیٹ

عزیز گرامی قدر! وعلیکم السلام

سید محمد عظیم برخیا قلندر بابا اولیاؒ، امام سلسلہ عظیمیہ کے ارشاد کے مطابق ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے ماورائی کیفیات کو چھپانے کا اہتمام اس لئے کیا ہے کہ انسانی شعور کم زور اور ناتواں تھا۔

اب جب کہ سائنسی ایجادات و ترقی نے شعور کو توانا کر دیا ہے اور فہم و فراست عام ہوگئی ہے، اس لئے ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاؒ کی جانب سے اپنے نانا حضرت تاج الدین ناگپوریؒ کی اجازت سے روحانی علوم کو منظر عام پر لانے کی جدوجہد کی جارہی ہے۔

کتنی کامیابی ہوتی ہے، کب ہوتی ہے، یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام روحانی علوم کی ترویج کے لئے تن من دھن سے لگے رہنا ہے، صرف اللہ اور اس کے محبوبؐ کی رضا اور خوش نودی کے لئے۔

نمک اور مٹھاس دونوں کی اہمیت ہے۔ مٹھاس کی قسمیں ہیں۔ مٹھاس میں سب سے زیادہ لطیف، پاکیزہ مٹھاس شہد ہے۔ شہد ایسی مٹھاس ہے کہ جس سے شعور انسانی کو اس طرح تقویت ملتی ہے کہ وہ لاشعوری واردات و کیفیات کو قبول کرنے میں تھکن محسوس نہیں کرتا۔

اس کے برعکس دوسری مٹھاس مثلاً گڑ، چینی اور شوگر سے بنے ہوئے دیگر مرکبات شعور پر بوجھ بنتے ہیں اور شعور، لاشعوری کیفیات کو قبول کرنے میں کم زوری محسوس کرتا ہے۔

آپ غور کریں ہم جو کچھ کھاتے ہیں ان سب میں مٹھاس ہے۔ گیہوں، چنا، باجرا، جوار، جو، پھل فروٹ، دودھ، پانی، ترکاریاں — مطلب یہ ہے کہ ہماری غذا میں اتنی مٹھاس ہے کہ ہمیں اضافی مٹھاس کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ شہد چوں کہ لطیف، پاکیزہ اور اللہ کے فرمان کے مطابق شفا ہے، اس لئے رسول اللہؐ نے شہد کو پسند فرمایا اور اسے کھانے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں شہد کی مکھی پر وحی کرتا ہوں۔''

شہد میں وحی کی نورانیت موجود ہے۔

دعا گو، عظیمی (جون 1993ء)

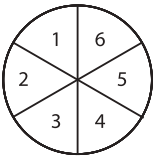

نامے میرے نام

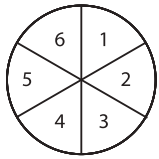

خواتین وحضرات قارئین — السلام علیکم، ذہن میں ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے مطالعہ کے بعد کوئی ایسا خیال آتا ہے جس کا جواب نہ ملنے سے تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ آپ لکھئے — اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ انشاءاللہ جواب شائع کیا جائے گا۔

دسمبر 2018ء میں محترم ارسلان مشتاق کا خط ''نامے میرے نام'' میں شائع ہوا جس میں زمان حقیقی اور دیگر زمانوں کے حوالہ سے پوچھا گیا۔ ادارہ نے جواب کے لئے قارئین سے رجوع کیا۔ منتخب جوابات یہ ہیں۔

حارث زبیر (کراچی): سیریل اور نان سیریل، حقیقی ٹائم کو سمجھنے کی طرزیں ہیں۔ جس طرح ڈائی مینشن سے واقف ہو کر فرد کو ڈائی مینشن کا نہ ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح سیریل اور نان سیریل سے حقیقی ٹائم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

نادیہ (لاہور): سیریل ٹائم کا فرد جب نان سیریل ٹائم میں داخل ہوتا ہے تو اب سیریل ٹائم اس کے لئے مفروضہ ہے۔ اسی طرح حقیقی ٹائم میں داخل ہونے سے نان سیریل ٹائم مفروضہ ہو جاتا ہے۔ کائنات میں صرف حقیقی ٹائم موجود ہے، محدود شعور اس کو نہیں سمجھتا اس لئے مختلف نام رکھ کر سمجھایا جاتا ہے۔

مرسلین (اسلام آباد): قرآن کریم کے مطابق کتاب المبین زمان حقیقی کو ظاہر کرتا ہے جس میں تمام عالمین کا ریکارڈ ہے۔ اطلاع کے نزول کا معین نظام ہے۔ اطلاعات مظہر بننے کے بعد کتاب المرقوم کا حصہ بن جاتی ہیں۔ سیریل ٹائم کا تعلق عالم ناسوت سے ہے جب کہ نان سیریل ٹائم میں ترتیب نہیں۔ دسمبر 2018ء کے ''آج کی بات'' میں مثال دی گئی ہے کہ قطرہ سمندر میں سمندر اور پتھر پہاڑ میں پہاڑ ہے۔ پتھر اور قطرہ کا تشخص پہاڑ اور سمندر سے الگ ہو کر بنتا ہے۔ سیریل ٹائم اور نان سیریل ٹائم بھی زمان حقیقی سے الگ ہو کر ظاہر ہوتے ہیں۔

★ ——— ★

تسنیم احمد (گوجرانوالہ): پچھلے چند ماہ سے نامے میرے نام میں عنوان کے دائیں بائیں دو دائرے بنائے گئے ہیں۔ ان کے اندر چھ مثلثیں 1 سے 6 تک بنائی گئی ہیں۔ کیا اس سے مراد شعور کے درجات اور دوسرے دائرہ میں لاشعور کے درجات کی طرف اشارہ ہے؟ درخواست ہے کہ اس بارے میں تفصیل سے راہ نمائی فرمائیں۔

★ جواب کے لئے کتاب ''قلندر شعور'' اور ''احسان وتصوف'' کا مطالعہ کیجئے۔

اراکین مراقبہ ہال عجمان: ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا دنیا میں پہلا آدم مرد تھا — ؟ روایات میں ہے کہ آدم

نے علم الاسما کے تحت حوا کی تخلیق کی۔ کیا آدم زمین پر دوسری مخلوقات کی طرح پہلے سے موجود تھا — ؟

★ نیوٹرل ہوکر تفکر کیا جائے تو کائنات کی ساخت میں جوڑے جوڑے پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم الاسما سکھایا تو اس علم کے تحت روح نے مختلف لباسوں کو ترتیب دیا۔ ایک لباس کا نام مرد اور دوسرے لباس کا نام عورت ہے۔ واحد خالق ہستی نے مخلوق کو تخلیق کیا۔ مخلوق در مخلوق ظاہر ہونے کے لئے دو رخوں ''male female'' کا ہونا ضروری ہے۔

اراکین مراقبہ ہال اسلام آباد: اکتوبر 2018ء کے رسالہ میں رنگوں پر تفکر کی دعوت دی گئی کہ کیا زمین پر کوئی شے بے رنگ ہے۔ گروپ ڈسکشن کا خلاصہ پیش ہے — کائنات کی ہر شے = لہر = رنگ اور رنگ دوری ہے۔ شے روشنی کے تانے بانے پر قائم ہے۔ روشنی اسکرین پر بکھرتی ہے تو رنگ ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم یہ سمجھے ہیں کہ رنگ اطلاع ہے اور اطلاع میں رموز ہیں۔ جب ہم رنگوں کے بکھرنے کو دیکھتے ہیں تو دراصل اطلاع کے بکھرنے یعنی تغیر کو دیکھتے ہیں۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نارنگی زرد رنگ کی ہے یا شعوراً سے زرد دکھتا ہے — ؟

آپ نے جو تفکر کیا ہے، اس میں سوال کا جواب موجود ہے۔

محمود (لاہور): ملا دوپیازہ کی اول قسط پڑھ کر شرارتوں پر ہنسی آئی لیکن محسوس ہوا کہ لوگوں کو ہنسانے والا خود تنہا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی کم زوری لوگوں پر ظاہر کر دیتا تو لوگ اس کا جینا دشوار کر دیتے۔ مزید اقساط کا انتظار ہے۔

محمد بلال خان (کراچی): مضمون پڑھ کر لگتا ہے کہ فطرت اور نیچر ایک نہیں۔ قرآن کریم نے فطرت معین مقداروں کو کہا ہے جب کہ سائنس نیچر کو تخلیق کار سے تعبیر کرتی ہے۔ فطرت ہو یا نیچر — دونوں تخلیق ہیں، ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ڈاکٹر فواد بشیر صاحب کی تحقیق اور موضوع پسند آیا۔ ان کو اس کاوش پر مبارک باد۔

رفعت (کراچی): کتاب المبین سے متعلق حضور قلندر بابا اولیاؒ کی تحریر کو تصویر میں دیکھ کر سوچا کہ کائنات میں ہر شے کا تصویری ریکارڈ ہے، اسی لئے سرورق بنانے والے نے اپنے تصور میں تحریر کو جس طرح سے دیکھا، منظر کشی کر دی۔ ہر ماہ رسالہ نیا لگتا ہے۔ اگر کوئی بات دہرائی جاتی ہے تو غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کے مزید پرت کھولے گئے ہیں — فکر کے دریچے بے شمار اور ہر دریچہ ایک فکر ہے۔

عدنان امین (لاہور): میرے خیال میں ''مرشد کی باتیں'' میں 1+1=1 کی مساوات بہت اہم ہے۔ فہم تسلیم کرتی ہے کہ ایک میں جب ایک جمع ہوتا ہے تو وہ دو کیسے ہوسکتا ہے، وہ تو ایک رہے گا۔ اور اگر ایک اور ایک جمع ہوکر دو بنتے ہیں تو پھر دانائی کہتی ہے کہ وہ جمع ہی نہیں ہوئے، الگ الگ ہیں۔ اس سے پہلے یہ خیال ہمیں چھو کر بھی نہیں گزرا۔ بے شک یہ مرشد کریم کا اعجاز ہے کہ مرید کے ذہن میں ایسی بات ڈال دی جس سے اذہان کھلتے ہیں۔

★ ——— ★

دسمبر 2018ء کے ''آج کی بات'' پر موصول تفکر میں سے منتخب خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔

بی بی مریم (کراچی): پہلی سطر ہے کہ ''اندر کی دنیا میں وقت اور فاصلہ باہر کی دنیا سے الگ ہے۔'' میں الجھ گئی ہوں کہ جب میرا اندر کا ٹائم الگ اور باہر کا الگ ہے تو یہ صلاحیت کا اظہار ہے یا میری جہالت ---؟

★ **صلاحیت کا اظہار ہے اور اس صلاحیت سے ناواقفیت جہالت ہے۔**

پروفیسر محمد طاہر (چنیوٹ): ''ماہنامہ قلندر شعور'' کا ہر فقرہ موتی، ہر جملہ سمندر اور ہر مضمون ذہنی وسعت کا مظہر ہے۔ ''آج کی بات'' میں لکھا ہے، ''نگاہ اس وقت دیکھتی ہے جب اندر اور باہر میں فاصلہ ہو۔'' اندر اور باہر کی چیزوں کو ہمہ وقت کس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جب ہم باہر نہیں اندر دیکھتے ہیں تو پھر غیب سامنے کیوں نہیں آتا؟

★ **آنکھیں تو ہیں لیکن بینائی کم زور ہے۔ کم زور اس لئے ہے کہ رات دن آنکھوں کا استعمال ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ دانائی کیا ہے!**

حیدر علی (گلگت): دوست کی وساطت سے آپ کی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نفس مضمون میرے لئے نیا ہے۔ لکھا ہے کہ ''جس کو ہم باہر دیکھنا سمجھتے ہیں وہ کسی شے سے الگ ہو کر اسے دیکھنا ہے۔'' میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم اس شے کو اپنے اندر ہی خود سے الگ دیکھ رہے ہیں ---؟ پھر یہ اندر باہر کیا ہے ---؟

★ **اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صفات کا جو علم سکھایا ہے اس میں الوژن اور ریالیٹی یعنی اصل اور نقل وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ہم چوں کہ ردوبدل کو حقیقت سمجھ رہے ہیں اس لئے ردوبدل سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اور جہاں تغیر ہے وہاں نظر کی اصل مرکزیت پردوں میں چھپی رہتی ہے۔**

شاہ زیب (کراچی): رات کو دیکھنے والا زبان کے مطابق نام کو دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ رات کو کیسے دیکھے؟

★ **''آج کی بات'' دوبارہ پڑھیں، اس میں وضاحت کے ساتھ جواب موجود ہے۔ غور کیجئے مخلوق کی زندگی دو رخوں پر قائم ہے۔ ۱۔ جاگنا، ۲۔ سونا --- لیکن جب سونے اور جاگنے کا تجزیہ کیا جائے تو جاگنا اور سونا ایسی دو حالتیں ہیں کہ دن کے کام آدمی سونے کی حالت میں بھی کرتا ہے اور سونے کی حالت میں وہی کام کرتا ہے جو بیداری میں کرتا ہے۔**

انیس احمد (اسلام آباد): نوجوان اور درویش کی گفتگو پوری تحریر کا خلاصہ ہے۔ ''ہم کسی کو اس وقت دیکھتے ہیں جب خود کو نہیں دیکھتے۔ دنیا میں بھی شے کو دیکھنے کا یہی قانون ہے لیکن جب اللہ کا معاملہ آتا ہے تو ہم خود کو دیکھتے ہیں، اس لئے اللہ نظر نہیں آتا۔'' اس سے قبل ہمیں اس قانون کا علم نہیں تھا یعنی یہ عمل غیر ارادی طور پر ہم سے ہو رہا ہے۔ اب دیکھنے کی اس طرز کی نفی کیسے کریں ---؟

★ **قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھیں اور اس پر غور و فکر کریں۔ خالق کائنات کا ارشاد ہے،**

''ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔'' (القمر: ۵۳)

★ ———— ★

سرورق کی تشریح

نومبر 2018ء کے ''آج کی بات'' میں سرورق کی تفصیل سے وضاحت ہے اور دل کے دیکھنے پر زور دیا گیا ہے۔

دل کا دیکھنا کیا ہے ــــ؟ دل کا دیکھنا الوژن سے پاک ہے اور الوژن فریب ہے۔ ہم دنیا یا کائنات کو جس طرح دیکھتے ہیں، یہ ہمارا اپنا زاویہ ہے، کائنات کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ کیوں کہ ہم اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ ادراک کے لئے شے کو شے کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔

مثال کے طور پر اگر آپ دوست سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اسے ان حالات و واقعات میں رہ کر دیکھیں، جس میں دوست رہتا ہے۔ اپنی جگہ سے دوست کا موازنہ کرنا ــــ دوست سے عدم واقفیت ہے۔ کائنات کو دیکھنے کے لئے کائناتی نظر درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ''دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔''

یعنی الوژن سے پاک نظر۔ کائناتی نظر کیسے حاصل ہو ــــ؟

۱۔ بات ایک فرد سے دوسرے تک پہنچی اور ہوتے ہوتے جب آخری فرد تک آئی تو بات بدل گئی۔

۲۔ پیغام ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوا اور ہوتے ہوتے آخری مرحلہ پر پہنچا اور پیغام بدل گیا۔

اگر پیغام قبول کرنے والا مراحل یا لوگوں پر اکتفا کرنے کے بجائے پیغام کے سورس سے واقف ہونے کوشش کرے تو وہ من وعن پیغام قبول کرتا ہے اور الوژن ختم ہو جاتا ہے۔ (فضیلہ سومرو۔ حیدرآباد)

شب معراج ــــ نوع انسانی کے علم کی معراج کو ظاہر کرتی ہے۔ سات آسمانوں اور ان کے بعد کے عالمین کا مشاہدہ ــــ دراصل صلاحیتوں کا عطا ہونا اور ادراک ہے۔ معراج کی شب رسول اللہؐ نے بیت المقدس میں انبیائے کرام علیہم السلام کی نماز میں امامت فرمائی، اس کے بعد آسمانوں کا سفر شروع ہوا۔ یعنی ان دنیاؤں کا سفر جو مادی شعور سے ماوراہیں۔ ایک کے بعد ایک مدارج طے ہوئے، اور ان میں موجودات اور قوانین کا علم مشاہدہ بنا، یہاں تک کہ فرشتوں کے سردار جبرئیل نے سدرۃ المنتہیٰ کے بعد آگے جانے سے معذرت کر لی اور کہا کہ اس سے آگے میرے پر جل جائیں گے۔

خالق کائنات نے انسان کو خلیفۃ الارض بنایا ہے۔ انسان صلاحیت کے اعتبار سے مخلوقات پر فضیلت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تعریف بیان کی ہے کہ انسان ''احسن تقویم'' ہے، اسے اللہ نے انوار و تجلی کو جذب کرنے کی سکت عطا کی ہے۔ معراج کی شب — رسول اللہؐ نے رب العالمین اللہ کا دیدار کیا اور اس واقعہ کی شہادت اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر بیان کی کہ ''دل نے جو دیکھا، جھوٹ نہیں دیکھا۔''

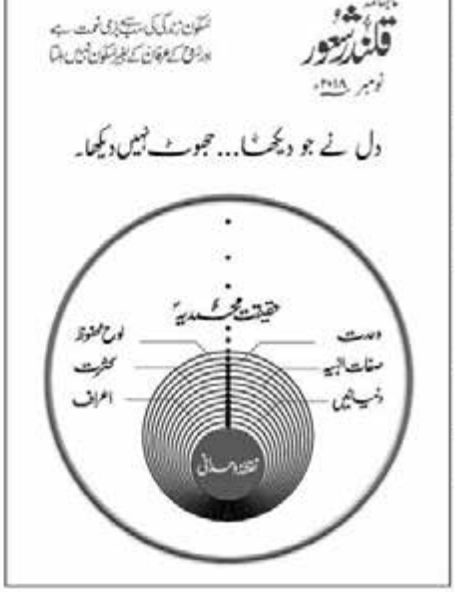

دل سے مراد گوشت پوست کا لوتھڑا نہیں بلکہ دل کا انتہائی درجہ ہے جسے قرآن میں ''فواد'' کہا گیا ہے۔ ''فواد'' سے واقف فرد کے اندر اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے عالمین در عالمین کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ''فواد'' وہ مقام ہے جہاں ڈائی مینشن مغلوب ہیں۔ ڈائی مینشن سے الوژن پیدا ہوتا ہے۔

جب نظر الوژن سے پاک ہوتی ہے تو ''فواد'' میں داخل ہوجاتی ہے۔ اگر ہم رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ پر صدق دل سے عمل کریں تو ''فواد'' سے واقف ہوجائیں گے۔ (ثمینہ فیصل۔ لاہور)

سرورق پر کئی روز تفکر کیا۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ نقطۂ وحدانی میں داخل ہونے کے بعد مادیت سے ماورا دنیا روشن ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم سب نقطۂ وحدانی کے اندر ہیں لیکن کسی مقام پر موجود ہو کر اس سے ناواقف رہنا — اس مقام میں داخل ہونا نہیں۔ داخل ہونا — پرت در پرت شے سے واقف ہونا ہے۔ سوال ذہن میں آیا کہ نقطہ کیا ہے اور اس میں کیسے داخل ہوں —؟ نقطہ ایسی اکائی ہے کہ جس کا اول و آخر، ظاہر و باطن ایک ہے یعنی ڈائی مینشن میں ہو کر ڈائی مینشن سے آزاد یا واقف ہونا۔ واقف ہو کر بھی فرد ڈائی مینشن میں ہی زندگی گزارتا ہے لیکن اسے ڈائی مینشن پر تصرف حاصل ہوجاتا ہے۔ تصرف کی صلاحیت — آزادی ہے۔

آدمی ڈائی مینشن کی دنیا میں رہتا ہے مگر اِس دنیا کا قانون بناتا ہے کہ یہاں کوئی مخلوق ایک حالت پر قائم نہیں۔ اگرچہ حالت میں تغیر ڈائی مینشن کے سبب ہے لیکن جس نظام کے تحت یہ سب ہو رہا ہے، اس میں تبدیلی

نہیں۔ نظام یہ ہے کہ شے جہاں سے آتی ہے، مظاہرہ کر کے وہاں چلی جاتی ہے۔ آنا — جانا — درمیان کا وقفہ — سب مرکز سے منسلک ہیں اور مرکز ایک ہے۔ پھر آنا کیا ہے، مظہر بننا کیا ہے اور مظاہرہ کر کے واپس چلے جانا کیا ہے — ؟ آنے اور جانے میں ہم صرف درمیان کے وقفہ پر غور کرتے ہیں جس کی وجہ سے دائرہ اور نقطہ سے لاعلم رہتے ہیں۔ یہی درمیانی وقفہ، دونوں عالمین کے درمیان پردہ ہے۔ رسول اللہؐ کی تعلیمات میں قرآن کریم میں غور وفکر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ غور وفکر سے نقطہ کھلتا ہے اور بندہ نقطہ کے اندر موجود دنیاؤں کو سکت کے مطابق دیکھ لیتا ہے۔ (عبداللہ خان۔ کراچی)

سرورق کو سمجھنے کے کئی زاویے ہیں مگر ہر زاویہ ایک ہی رخ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عالمین سے واقف ہونے کا طریقہ کار انبیائے کرام علیہم السلام اور آخری رسول حضرت محمدؐ کی تعلیمات پر عمل ہے۔

دل میں نقطہ اس وقت کھلتا ہے جب بندہ دل میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل کیا ہے — ؟ صوفی شاعر خواجہ میر دردؒ نے فرمایا،

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سماسکے

ارض وسما — دونوں ڈائی مینشن ہیں لیکن انسان کو اللہ نے دل میں ایک ایسا مقام عطا کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ''ما کذب الفؤاد ما رأیٰ'' — دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔ (جنید احمد۔ کراچی)

کائنات نقطہ میں بند ہے۔ تفکر کرنے والوں پر رموز آشکار ہوتے ہیں۔ سرورق پر سفید دائرہ کائنات کو اور سیاہ دائرہ مرکزیت کو ظاہر کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی موجودات ہیں ان سب کی حقیقت سیاہ نقطہ میں بند ہے۔

نقطۂ وحدانی میں ہر شے ریکارڈ ہے۔ علم کی جو معراج نبی آخر الزماںؐ کا اعزاز ہے، وہ کسی اور کا نہیں۔

حقیقت محمدیہؐ ایسا مقام ہے جہاں سے وسائل عالمین میں تقسیم ہوتے ہیں۔ تاج دار کائنات حضرت محمدؐ وہ ہستی ہیں جنہیں اللہ نے معراج کی شب اپنی قربت سے اس طرح نوازا کہ فرق دو کمانوں سے بھی کم رہ گیا۔

سرورق میں سورہ نجم کی آیت ''دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا'' لاشعور کے اس درجہ کی نشان دہی ہے جس کی خبر محبّ اور محبوب جانتے ہیں۔ (ڈاکٹر زبیر احمد۔ کراچی)

حضرت محمد رسول اللہؐ

حضور اکرمؐ کی سیرت و رسالت میں تمام پیغمبروں کی شان نظر آتی ہے۔ جس طرح رسول اللہؐ پوری کائنات کی ہر مخلوق کے لئے رحمۃ للعالمین ہیں اس طرح انبیائے کرامؑ کے لئے بھی رحمت ہیں۔

سرور دو عالمؐ کے متعلق انبیائے کرامؑ کی پیشین گوئیاں:

''پس جب آدمؑ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو اس نے آسمان میں سورج کی طرح ایک روشن تحریر دیکھی،

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تب آدمؑ نے اپنا منہ کھولا اور کہا:

''میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں پروردگار کیوں کہ تو نے مہربانی کی مجھے پیدا کیا لیکن میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ تو مجھے خبر دے کہ ان کلمات کے کیا معنی ہیں — ؟''

محمد رسول اللہؐ

تب اللہ نے جواب دیا:

''مرحبا ہے تجھ کو اے میرے بندہ آدم! اور میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پہلا انسان ہے جس کو میں نے پیدا کیا اور یہ شخص جس کو تو نے دیکھا ہے تیرا ہی بیٹا ہے جو اس وقت کے بہت سالوں بعد دنیا میں آئے گا اور میرا ایسا رسول ہوگا کہ اس کے لئے میں نے سب چیزوں کو پیدا کیا۔ وہ رسول محمدؐ جب دنیا میں آئے گا، دنیا کو ایک روشنی بخشے گا، یہ وہ نبی ہے کہ اس کی روح آسمانی روشنی میں ساٹھ ہزار سال قبل اس کے رکھی گئی تھی کہ میں کسی چیز کو پیدا کروں۔''

(انجیل برنباس: فصل ۳۹، آیت ۱۴۔۲۲)

حضرت نوحؑ کی پیشین گوئی:

''لوگو سنو! نراشنس (محمدؐ) کی لوگوں کے درمیان بہت تعریف کی جائے گی۔'' (اتھروید: ۲۰:۱۲۷:۱)

''اے نراشنس (محمدؐ) میٹھی زبان والے، قربانی دینے والے، میں آپؐ کی قربانیوں کو وسیلہ بناتا ہوں۔'' (رگ وید: ۱:۱۳:۳)

''اے اگنی (محمدؐ)! منو (نوحؑ) آپؐ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں۔'' (رگ وید: ۱:۱۳:۴)

''اے اگنی (محمدؐ)! ہم آپؐ کو منو (نوحؑ) کی طرح مذہبی پیشوا، داعی، مذہبی علوم سکھانے والا اور انتہائی عقل مند شخصیت جانتے ہیں۔'' (رگ وید: ۱:۴۴:۱۱)

حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی:

''تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے

ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی پیدا کرے گا، تم اس کی سننا۔'' (استثنا: باب ۱۸، آیت ۱۵)

''میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی بھیجوں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ اسے دوں گا وہی ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔'' (استثنا: باب ۱۸، آیت ۱۹۔۲۰)

''خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ وہ کوہ فاراں سے جلوہ گر ہوا۔ اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔'' (استثنا: باب ۳۳، آیت ۲)

حضرت داؤدؑ کی پیشین گوئی:

''تب جنگل کے درخت خوشی سے خداوند کے حضور گانے لگے کیوں کہ وہ زمین کا انصاف کرنے کو آرہا ہے۔ خدا کا شکر کرو اس لئے کہ وہ نیک ہے کیوں کہ اس کی شفقت ابدی ہے۔ تم کہو کہ ہماری نجات کے خدا ہم کو بچالے، اور قوموں میں ہم کو جمع کر اور ان سے ہم کو رہائی دے تا کہ ہم تیرے قدوس نام کا شکر کریں اور للکارتے ہوئے تیری ستائش کریں۔''
(۱۔تواریخ: باب ۱۶، آیت ۳۳-۳۵)

''اور وہی صداقت سے 'جہاں' کی تعریف کرے گا۔ وہ راستی سے قوموں کا انصاف کرے گا۔''
(زبور: باب ۹، آیت ۸)

''صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ صادق کے منہ سے دانائی ٹپکتی رہتی ہے اور اس کی زبان سے ایمان کی باتیں۔ اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے۔ وہ اپنی روش پر قائم رہے گا۔'' (زبور: باب ۳۷، آیت ۲۹۔۳۱)

''اپنے نور اپنی سچائی کو بھیج کہ وہی میری راہ بری کرے۔'' (زبور: باب ۴۳، آیت ۳)

''تو بنی آدم میں سب سے حسین ہے۔ تیرے ہونٹوں میں لطافت بھری ہے اس لئے خدا نے تجھے ہمیشہ کے لئے مبارک کہا۔ اے زبردست! تو اپنی تلوار کو جو تیری حشمت و شوکت ہے اپنی کمر سے حمائل کر اور سچائی اور حلم و صداقت کی خاطر اپنی شان و شوکت میں اقبال مندی سے سوار ہو اور تیرا داہنا ہاتھ تجھے مہیب کام دکھائے گا۔ تیرے تیر تیز ہیں، وہ بادشاہ کے دشمن کے دل میں لگے ہیں۔ امتیں تیرے سامنے زیر ہوئی ہیں۔'' (زبور: باب ۴۵، آیت ۲۔۵)

''راست بازوں کے لئے تاریکی میں ایک نور چمکتا ہے۔ وہ رحیم و کریم اور صادق ہے، رحم دل اور قرض دینے والا آدمی، سعادت مند ہے۔ اس کی صداقت ہمیشہ قائم رہے گی۔'' (زبور: باب ۱۱۲، آیت ۴۔۶)

حضرت سلیمانؑ کی پیشین گوئی:

''میرا محبوب سرخ و سفید ہے۔ وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔ اس کا منہ از بس شیریں ہے۔ ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔'' (غزل الغزلات: باب ۵، آیت ۱۰، ۱۶)

حضرت یسعیاہؑ کی پیشین گوئی:

''اور پھر وہ کتاب کسی ناخواندہ کو دیں اور کہیں اس کو پڑھ اور وہ کہے گا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔''

(یسعیا: باب ۲۹، آیت ۱۲)

حضرت زکریاؑ کی پیشین گوئی:

''دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے، وہ صادق ہے اور نجات اس کے ہاتھ میں ہے۔''

(زکریا: باب ۹، آیت ۹)

حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئی:

''جب بنی آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے تب وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا اور سب قومیں اس کے سامنے جمع ہو جائیں گی۔'' (متی: باب ۲۵، آیت ۳۱۔۳۲)

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کہوں گا کیوں کہ دنیا کا سردار آتا ہے۔'' (یوحنا: باب ۱۴، آیت ۳۰)

''اور تھوڑی مدت باقی ہے کہ آنے والا آئے گا اور دیر نہ کرے گا اور میرا راست باز بندہ ایمان سے جیتا رہے گا۔''

(عبرانیوں کے نام خط: باب ۱۰، آیت ۳۷۔۳۸)

''تمام انبیا سوائے اس رسول کے آچکے ہیں جو میرے بعد آئے گا کیوں کہ اللہ اس امر کا ارادہ رکھتا ہے کہ میں اس کے راستہ کو صاف کروں۔''

(انجیل برنباس: فصل ۳۵، آیت ۶)

''بے شک وہ محمد رسول اللہؐ ہے اور جب وہ دنیا میں آئے گا تو اس کی اصلی رحمت کے وسیلہ سے جس کو وہ لائے گا انسانوں کے درمیان نیک اعمال کا ذریعہ بنے گا۔'' (انجیل برنباس: فصل ۹۶، آیت ۱۴۔۱۵)

''اور یوں جب اس نے عمل کا ارادہ کیا تو سب چیزوں سے پہلے اپنے رسول کی روح پیدا کی، وہ رسول جس کے سبب سے تمام چیزوں کے پیدا کرنے کا قصد کیا، تاکہ مخلوقات خوشی اور اللہ سے برکت پائے اور اس کا رسول ان کے اخلاق سے خوش ہو۔''

(انجیل برنباس: فصل ۴۳، آیت ۹۔۱۱)

''درحقیقت وہ اسماعیل کی نسل سے آئے گا اور یہ وعدہ اسماعیل کے ساتھ کیا گیا تھا نہ کہ اسحٰق کے ساتھ۔''

(انجیل برنباس: فصل ۴۳، آیت ۳۱)

''مگر میری تسلی اس رسول کے آنے میں ہے جو میرے بارے میں ہر جھوٹے خیال کو محو کر دے گا اور اس کا ذہن پھیلے گا اور تمام دنیا میں عام ہو جائے گا۔''

(انجیل برنباس: فصل ۹۷، آیت ۵)

صبر و استقامت:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ،

''کائنات میں سب سے پہلے میرا نور بنا اور اس نور سے اللہ نے کائنات کی تخلیق کی۔''

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جتنے پیغمبران کرامؑ تشریف لائے سب حضور اکرمؐ کے نور کا پرتو ہیں۔ پیغمبران کرامؑ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت دی ہے اور آسمانی کتابوں میں حضورؐ کے آنے کا تذکرہ ہے۔

تمام پیغمبران کرامؑ کی تعلیم یہ ہے کہ،

''اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی عبادت اور پرستش کے لائق ہے، اس کے علاوہ سارے معبود باطل ہیں۔''

پیغمبروں نے جن حالات میں زندگی گزاری ہے اور تبلیغ میں جو اذیتیں برداشت کی ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان کو جو صبر و استقامت دیا ہے، وہ سب حضور اکرمؐ میں موجود ہے۔

حضور اکرمؐ کی سیرت و رسالت میں تمام پیغمبروں کی شان نظر آتی ہے۔ جس طرح رسول اللہؐ پوری کائنات کی ہر مخلوق کے لئے رحمۃ للعالمین ہیں اس طرح انبیائے کرامؑ کے لئے بھی رحمت ہیں۔

محمد رسول اللہؐ نے حضرت نوحؑ کی طرح لوگوں کے لئے خفیہ اور اعلانیہ خلوت و جلوت میں گزرگاہوں، پہاڑوں اور میدانوں میں وحدانیت کی تبلیغ فرمائی۔

محمد رسول اللہؐ نے حضرت ابراہیمؑ کی طرح نافرمان قوم سے علیحدگی اختیار کی اور ہجرت کی۔ محمد رسول اللہؐ ہجرت کی شب حضرت داؤدؑ کی طرح دشمنوں کے نرغہ میں سے بحفاظت نکل گئے۔

محمد رسول اللہؐ نے حضرت ایوبؑ کی طرح صبر و شکر کے ساتھ گھاٹی میں تین سال گزارے۔ محمد رسول اللہؐ، حضرت یونسؑ کی طرح تین دن غار ثور میں رہے۔

محمد رسول اللہؐ نے حضرت موسیٰؑ کی طرح جنہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون مصر کی غلامی سے آزاد کرایا تھا، شمالی عرب کو شاہ قسطنطنیہ سے اور مشرقی عرب کو کسریٰ ایران کی حلقۂ غلامی سے اور جنوبی عرب کو شاہ حبش سے نجات دلائی۔ محمد رسول اللہؐ نے حضرت سلیمانؑ کی طرح مدینہ میں اللہ کا گھر بنایا۔ محمد رسول اللہؐ نے حضرت یوسفؑ کی طرح اپنے ایذا رسا بھائیوں کے لئے نجد سے غلہ بھجوایا اور آخر میں فتح مکہ کے دن ان پر احسان فرمایا۔ آپؐ، حضرت مسیح کی طرح جھٹلائے اور ستائے گئے لیکن آپؐ نے صبر و شکر کیا۔

محمد رسول اللہؐ نے حضرت یحییٰؑ کی طرح بیابانوں، قریوں، بستیوں اور شہروں میں اللہ کا پیغام پہنچایا۔

(قسط: ۲)

اے خیر آسمان و زمیں خیر بحر و بر
اے خیر کل جن و ملک خیر کل بشر
اے چشمۂ حیات مسیحائے کائنات
بیماروں کے طبیب مریضوں کے چارہ گر
اے راہ نمائے قافلۂ اہل عرش و فرش
اے مہر و ماہ منزل و قندیل رہ گزر
اپنی بساط ہی نہیں تعریف کیا کریں
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
ہم سرنگوں ہیں اور معافی کے خواست گار
بس اک سخن بس ایک اشارہ بس اک نظر

(کلام: کلیم احمد)

آئینۂ دل

کس نے کہا کہ ہم الگ ہیں۔تم دیکھ رہے ہو کہ تم میرے اندر ہو۔ مجھے خود سے الگ کر کے دکھاؤ۔ سامنے سے ہٹ سکتے ہو لیکن سامنے کھڑے ہو کر الگ نہیں ہو سکتے۔جس شکل میں مجھے اور میرے اندر خود کو دیکھتے ہو ــــ کائنات کی ہر شے کا مظاہرہ اسی طرح ہے۔

ہمیں اس بات کا علم ہو یا نہ ہو کہ جب ہم کسی شے کی تلاش میں گم ہوتے ہیں تو بظاہر ذہن میں مادی رخ ہوتا ہے لیکن دراصل ہم جانے انجانے میں ''حقیقت'' کو ڈھونڈتے ہیں۔

سمجھا جاتا ہے کہ محرک کو تلاش کرنا سائنس دان، فلسفی یا مفکر کا کام ہے کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایجادات سے شہرت پائی۔حقیقت یہ ہے کہ سائنس دانوں کی ایجادات، مفکرین کے فلسفے اور فلسفیوں کے اقوال حقیقت کے تعارف سے عاجز ہیں کیوں کہ عقل کی انتہا حیرت اور حیرت کے پس پردہ حقیقت ــــ عقل سے ماورا ہے۔

تحقیق و تلاش کی عمومی روش ظاہر پر تفکر اور باطن سے صرف نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادی ذہن سے تحقیق کرنے والا حقیقت سے دور اور حقیقت ان سے دور ہے۔درمیان کا خلا تغیر سے پُر ہوتا ہے۔

محققین اور مفکرین کے برعکس اہلِ فکر و نظر کی ایک جماعت ایسی ہے جن کے لئے منقول ہے کہ تفکر کا ایک راستہ وہ ہے جہاں منطق و دلیل کا گزر نہیں ــــ ادراک زادِراہ ہے۔

سب متفق ہیں کہ حقیقت کا کلّی ادراک ممکن نہیں، بندہ فہم کی مناسبت سے مدارج طے کرتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور سمندر جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں، تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔'' (لقمٰن: ۲۷)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے،

'' نور پر نور، اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جسے چاہے۔'' (النور: ۳۵)

یہ تحریر ایسے شخص کی ہے، جو آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا تو ادراک کی دنیا اور اپنے اندر رموز کی طرف متوجہ ہو گیا۔اسی کی زبانی پڑھئے۔

آئینہ کے سامنے کھڑا خود کو دیکھ رہا تھا کہ آواز آئی،

یہاں صرف تم نہیں، میں بھی موجود ہوں۔

ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی نہیں تھا۔

گمان سمجھ کر توجہ ایک بار پھر آئینہ پر مرکوز کی۔ محسوس ہوا آئینہ مسکرا رہا ہے۔ اس سے پہلے آئینہ کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جان کر حیرت ہوئی کہ آواز سامنے موجود اسکرین سے آرہی ہے جس پر میں منعکس ہوں۔ اس سے پہلے میں خود کو دیکھ رہا تھا، اب توجہ آئینہ پر مرکوز ہوگئی۔

آئینہ بولا، تم روز میرے سامنے کھڑے ہوتے ہو۔ جو کچھ تمہارے اندر ہے میں اسے تم پر منعکس کر دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میرے سامنے کھڑے ہونا دو رموز کا اقرار ہے۔

چوکنا ہوگیا اور پوچھا— کس بات کا اقرار؟

اول یہ کہ تم خود سے واقف نہیں۔ پھر خود کو پہچاننے کے لئے تمہیں میری ضرورت ہے۔ دیکھ لو ہم دونوں کا مقام کیا ہے اور میرے مقابل تمہاری کیا حیثیت ہے۔

میں خود سے واقف کیوں نہیں، نوع آدم کا فرد ہوں اور مخصوص نام، صفات اور خدوخال رکھتا ہوں۔

آئینہ بولا، کیا تم یہی ہو—؟ یہ صفات تو تمہارے علاوہ دیگر نوعوں کے افراد میں بھی ہیں۔ سب کو میرے سامنے کھڑا کر دو، ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن مختلف ہونے کے باوجود نام، اعضا، صفات سب مشترک ہیں۔ آنکھ، ناک، کان تمہارے پاس ہیں اور ان کے پاس بھی۔ پھر تم ان سے یا وہ تم سے کس طرح الگ ہوگئے—؟ اگر اس کو انفرادیت کہتے ہو تو اس انفرادیت میں بھی اجتماعیت ہے۔ الگ ہونے کے باوجود تقاضے یکساں ہیں۔

میں نے کہا، ٹھیک ہے آنکھ ناک کان اور حواس سب کے پاس ہیں لیکن خدوخال تو مختلف ہیں اور یہی ہماری شناخت ہے۔

آئینہ نے کہا، اگر خدوخال شناخت ہیں تو بچپن سے لے کر اب تک تم ہر روز تغیر سے گزر رہے ہو۔ ہر لمحہ خلیات ٹوٹ پھوٹ کر نئے خلیات کا مظاہرہ ہو رہا ہے، نقش و نگار بدل رہے ہیں۔ کیا تغیر کسی کی پہچان ہوسکتا ہے—؟ تم وہ نہیں ہو جو کل تھے۔

میں نے پوچھا، یہ بات وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟

آئینہ بولا، اس لئے کہ میں روز تمہیں اپنے اندر جذب کرتا ہوں تمہاری مقداروں، ان میں ردوبدل یا توازن سے واقف ہوں۔ جو کچھ تمہارے اندر ہے، منعکس کر دیتا ہوں۔ کل تم افسردہ تھے، کچھ دیر قبل خوش اور اب حیرت میں ہو۔ جذبات بدلنے سے خلیات تبدیل ہوئے، میں نے جو دیکھا تمہیں لوٹا دیا اسی لئے مجھے آئینہ کہتے ہیں۔

پوچھا، پھر میری شناخت کیا ہے اور تم کون ہو—؟

آئینہ بولا، میں تم سے الگ نہیں اسی لئے تم میرے اندر خود کو دیکھ رہے ہو۔ میرے بغیر تم خود کو نہیں دیکھتے۔ میں دیکھتا ہوں اور دکھاتا بھی ہوں۔ تم خود کو

نہیں ، میرے دیکھنے کو دیکھتے ہو اور میں وہی دیکھتا ہوں جو تم ہو۔

اگر میں تمہارے اندر جذب ہوں تو پھر میں اور تم الگ کس طرح ہیں۔ دیکھ لو ہمارے درمیان فاصلہ ہے۔تم دیوار پر اور میں یہاں ہوں۔

کس نے کہا کہ ہم الگ ہیں۔تم دیکھ رہے ہو کہ تم میرے اندر ہو۔ مجھے خود سے الگ کر کے دکھاؤ۔ سامنے سے ہٹ سکتے ہو لیکن سامنے کھڑے ہو کر الگ نہیں ہو سکتے۔جس شکل میں مجھے اور میرے اندر خود کو دیکھتے ہو ــــ کائنات کی ہر شے کا مظاہرہ اسی طرح ہے۔ یہاں ہر شے آئینہ ہے۔آئینہ میں خود کو دیکھ کر سب سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں۔آئینہ نہ ہو تو کسی کو اپنی پہچان نہیں ہوگی۔اب تک تم خود کو دیکھ رہے تھے اس لئے میں پس منظر میں رہا اور تم نے سمجھا کہ میں الگ ہوں اور تم الگ ہو جب کہ تم میرے اندر جذب ہو۔مسئلہ تمہاری ''میں'' کا ہے۔

میں نے کہا، عجیب منطق اور فلسفہ ہے۔

آئینہ بولا، منطق اور فلسفہ دلیل مانگتے ہیں ، میں بے دلیل تمہارے سامنے ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے وجود کی دلیل کے لئے تمہیں میرے سامنے آنا پڑتا ہے یا میرے اندر جذب ہونا پڑتا ہے تب تمہیں اپنی موجودگی کا یقین آتا ہے۔

میں نے کہا، اگر میں تمہاری وجہ سے خود کو پہچانتا ہوں تو تم بھی میری وجہ سے آئینہ ہو۔ میں سامنے نہ آؤں تو تمہیں بھی اپنی پہچان نہ ہو۔

آئینہ ہنس پڑا۔

میں گھبرا گیا کہ کہیں ہلنے سے ٹوٹ نہ جائے۔

آئینہ بولا، میں اپنی ہستی سے واقف ہوں ۔کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، مجھے کس طرح بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم میرے سامنے آتے ہو تو تمہارے ہونے کے باوجود میری انفرادیت برقرار رہتی ہے۔خود کو دیکھنے کے لئے مجھے تمہاری ضرورت نہیں، میں تمہارے اور اپنے ــــ دونوں کے لئے آئینہ ہوں۔

میں نے پوچھا، پھر میں کون ہوں؟

آئینہ بولا، بہت کم لوگ اس حقیقت کے بارے میں سوچتے ہیں۔اکثریت غیر اہم جان کر اس طرف متوجہ نہیں ہوتی۔تمہارا جسم اور تاثرات ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں ۔ جو شے تبدیل نہیں ہوتی، تم وہ ہو۔ واقف ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرو اور اختیار و اقتدار سے کنارہ کش ہو جاؤ۔جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہتیں، ایک جسم میں دو وجود نہیں رہ سکتے۔

ایک جسم میں دو وجود ــــ؟

ہاں! ایک تمہاری میں اور دوسری تمہاری اصل۔ اقتدار ''اصل'' کے پاس ہے لیکن ''میں'' خود کو طاقت ور دیکھنا اور برتری کا اعتراف چاہتی ہے جو بے سکونی اور شکست و ریخت کا سبب ہے۔اچھا بتاؤ جب مجھے دیکھتے ہو تو کیا دیکھتے ہو؟

میں نے کہا، اپنی صورت۔

آئینہ نے پوچھا، کیا اس بات میں شبہ ہے کہ آئینہ میں خود کو دیکھ رہے ہو یا کسی اور کو؟

کہا، کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

خود کو دیکھتے ہوئے کوئی زائد شے نظر آتی ہے؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آئینہ مسکرایا اور پوچھا، تمہیں کیسے پتہ کہ کیا زائد ہے اور کیا کم ــــ میرے بغیر تم خود کو نہیں پہچانتے۔ پھر کم یا زائد ہونے کا کیسے پتہ چلے گا؟

اس لئے کہ میں ہر بار خود کو ایک ہی دیکھتا ہوں، تاثرات کا فرق ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا آج میں بغیر سینگ کا ہوں تو کل میرے سر پر سینگ نظر آئیں۔

آئینہ نے پوچھا، پھر مجھ میں وہ کیا ہے جسے تم اپنا آپ کہتے ہو؟

جواب دیا، میری صورت۔

وہ بولا، اور تمہاری صورت مجھ سے الگ نہیں ہے۔

پوچھا، کہنا کیا چاہتے ہو؟

آئینہ نے کہا، نفس اور تغیر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ خود کو اور اردگرد کو جانتے ہو۔ لیکن کوئی اس کے برعکس بتائے تو شک کرتے ہو۔ جیسے میری اور تمہاری گفتگو۔

میں نے کہا، جب خود پر یقین ہو اور دوسرا اس کے برعکس کہے تو سوچ میں اختلاف ہوگا۔

وہ بولا، یہ یقین رکھنا کہ آئینہ میں تم ہی ہو، کوئی اور نہیں، اس لمحہ اور جگہ پر منحصر ہے۔

میں نے لاپروائی سے جواب دیا، ظاہر ہے ایک وقت میں میں ایک ہی جگہ ہوسکتا ہوں۔

آئینہ نے کہا، ایسی بات ہے تو نیند میں تم بستر پر ہوتے ہو اور گھومتے پھرتے بھی ہو۔ تم ایک ہی ہو لیکن تمہارے کئی لباس ہیں جو مقام کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ نیند کے بعد بھی دنیائیں ہیں۔ جس طرح یہاں سفید رنگ میں تم الگ اور سیاہ میں مختلف دکھائی دیتے ہو اسی طرح ہر عالم میں لباس مختلف ہے لیکن تم مختلف نہیں ہو۔ حقیقت جاننے کے لئے لباس کے فرق کو سمجھو جس کی وجہ سے تم خود کو حقیقت سے الگ سمجھتے ہو۔

آئینہ کی باتوں سے ذہن پر بوجھ پڑ گیا اور میں کہے بغیر رہ نہ سکا۔ تمہاری باتوں سے ذہن پر دباؤ کیوں محسوس ہو رہا ہے؟

وہ بولا، استعداد کم ہونے کی وجہ سے کیوں کہ شعور میں وسعت نہیں ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس پر غور کرنے سے دباؤ درجہ بہ درجہ کم ہوگا اور اسرار کھلیں گے۔ چلو مشکل آسان کئے دیتا ہوں۔ آئینہ عکس کو منعکس کرتا ہے۔ پوری کائنات آئینہ ہے اور تم عکس ہو۔ درخت کے سامنے کھڑے ہو جاؤ تو اپنا سایہ درخت کے تنے پر نظر آتا ہے۔

تو کیا درخت بھی آئینہ ہے ــــ؟

آئینہ مسکرا دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا،

جس شے کے سامنے کھڑے ہوگے خود کو منعکس دیکھو گے۔ میں بتا چکا ہوں کہ عکس مقام کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔اس بات پر غور کرنے سے رموز سامنے آتے ہیں۔اسی طرح تم کسی شخص سے ملے اور اس میں عیب نظر آیا تو دراصل اس کے اندر اپنی صورت دیکھی ہے۔یہاں ہر شے آئینہ ہے اور ہم آئینہ میں خود کو دیکھتے ہیں۔عیب اندر سے ختم کرلو، آئینہ میں نظر نہیں آئے گا۔بعض آئینوں پر نشان بھی لگے ہوتے ہیں لیکن ہماری توجہ نہیں جاتی، وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔اسی طرح اگر کسی میں عیب ہے، نظر انداز کردو۔متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عیب کہیں نہ کہیں تمہارے اندر ہے۔اللہ کے دوستوں کا وصف ہے کہ وہ کسی کے عیب کو ظاہر نہیں کرتے، باطنی طور پر فرد کو اصلاح کی طرف مائل کرتے ہیں۔

میں نے آئینہ سے پوچھا، جب میں ہر جگہ اپنا عکس دیکھتا ہوں تو پھر میری اصل کہاں ہے اور کیا ہے—؟

آئینہ بولا، یہ تلاش کرنا تمہارا کام ہے، میرا کام متوجہ کرنا تھا۔اس مقام سے آگے کا سفر تمہیں خود طے کرنا ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں۔یہاں ہر شے میں اللہ کی حکمت اور نشانی ہے۔اس سفر کی ابتدا اپنے آپ سے کرو۔جو ابتدا روشن اور محکم ہو، اس کی انتہا بھی روشن اور پائیدار ہوتی ہے۔

مجھے میرے اندر آئینہ دکھا کر آئینہ خاموش ہوگیا۔

مٹی کی کشش

مٹی سے نکلتے ہیں پرندے اُڑکر
دنیا کی فضا دیکھتے ہیں مڑمڑکر
مٹی کی کشش سے اب کہاں جائیں گے
مٹی نے انہیں دیکھ لیا ہے مڑکر

پرندے جو اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔زمین سے بہت دور فضا میں پرواز کرتے ہوئے زمین کا نظارہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زمین سے بہت دور نکل آئے ہیں لیکن جس مٹی کی کشش سے ان کے بال و پر بندھے ہوئے ہیں، اس سے یہ کیسے آزاد ہوسکتے ہیں؟

تمام جان دار مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔مٹی سے مراد روشنیوں کا وہ خلط ملط ہے جس میں تمام رنگ موجود ہیں۔اسے کل رنگ روشنی بھی کہا جاتا ہے۔یہی رنگ درخت کی جڑیں زمین سے حاصل کرتی ہیں۔اور یہی رنگ تنا، شاخوں، پتوں، پھول اور پھل میں نمایاں ہوجاتے ہیں لیکن تخلیق کی یہ طرز دیرپا نہیں ہے، جلد ہی یہ تخلیق پھر مٹی بن جاتی ہے۔

دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔ایک بالواسطہ اور دوسری براہ راست۔بالواسطہ دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ پرندے اوپر سے نیچے دیکھ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم مٹی کی گرفت سے آزاد ہوچکے ہیں۔براہ راست طرز یہ ہے کہ خود مٹی انہیں دیکھ رہی ہے اور مٹی کا یہ دیکھنا ہی کشش ثقل (gravity) ہے۔ایک دن یہ مٹی اپنی کشش سے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ ہر ذی روح مٹی کے ذرّات میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ (ادارہ)

معمار

نوع آدم میں سے ایک ملک میں کسی قوم ،کسی برادری اور کسی کنبہ کے ایک فرد نے زمین خریدی۔ زمین پر مکان بنانے کے لئے دماغ میں نقشہ ابھرا۔ نقشہ میں شعوری حد بندیوں کے ساتھ ایک منصوبہ بنا۔منصوبہ میں یہ بات سامنے آئی کہ پلاٹ کی تقسیم ایسی کی جائے کہ خاندان کے افراد آسائش وآرام پائیں۔ منصوبہ کے مطابق کمرے بنے ،کمروں میں ملحقہ باتھ روم بنے، باورچی خانہ بنا، بالکونی، راہ داری، کھڑکیوں اور دروازوں سے مکان کو آراستہ کیا گیا۔

دھرتی پر ایک مکان بنانے کے لئے آدمی کو کئی مراحل سے گزرنا پڑا تب خوب صورت مکان کی تعمیر ہوئی۔

بچپن کی بات ہے کہ دادا کی حویلی کے سامنے غیر آباد زمین پر انار کا درخت تھا۔ درخت میں گلنار سرخ رنگ پھول لگے تھے۔ ہری بھری شاخوں اور ہرے بھرے پتوں سے درخت کا جوبن نکھر آیا تھا۔میں انار کے درخت پر پھولوں کو دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔انار کلی میری توجہ کا زیادہ مرکز بنتی تھی۔ یاد نہیں کتنے سال بیت گئے کہ میں وطن سے دور آوارگرد کہاں کہاں گھومتا رہا۔کبھی کسی ساحل پر ہوتا اور کبھی ریگستان میں۔کبھی بیابانوں میں اور کبھی مرغزاروں میں۔میں نے مسجدوں میں اذانیں دیں۔مندر میں آرتی پوجا دیکھی۔گرجاؤں میں مقدس پانی سے بپتسمہ دیتے دیکھا۔ مزاروں پر جبیں سائی کی۔شاہی مقبروں میں چمگادڑوں کا بسیرا دیکھا۔ پرانے قبرستانوں میں مستقل سکونت کے لئے آنے والوں کے نام کندہ دیکھے ،وہاں امیر، غریب، فقیر، بادشاہ سب کو مٹی ہوتے دیکھا اور اس مٹی پر لوگوں اور چرندوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔لیکن کہیں بھی مجھے وطن کی مٹی کی خوش بو نہیں آئی۔

وطن کی یاد آئی تو پھر خود کو دادا کی حویلی کے سامنے پایا۔اب اس زمین پر انار کا درخت نہیں تھا۔انار کلی تھی اور نہ سرخ رنگ گلنار تھا— مجھے جھٹکا لگا۔ انار کے درخت نے اپنے وجود کا احساس دلایا۔میرے اندر انار کا جو سراپا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

میں نے سوچا کہ اس زمین پر انار کا درخت تھا۔ظاہر ہے کسی نے لگایا ہوگا، بیج ڈالا ہوگا، بیج کسی نے نہ بھی بویا ہو تو ہوا میں اڑ کر زمین کی کوکھ میں سمایا ہوگا۔ بہر حال یہ مسلمہ ہے کہ انار کا درخت بیج سے اگتا ہے، بیج کے بغیر انار کے درخت کا وجود زیر بحث نہیں آتا۔ جب انار کا وجود بیج کے اوپر قائم ہے تو کہا جائے گا کہ بیج میں انار کا پورا درخت ہوتا ہے۔ چھوٹے سے بیج کے اندر کتنی

شاخیں ہوں گی، کتنے پھل لگیں گے، کیا رنگ ہوگا، کھٹا یا میٹھا ذائقہ، یہ بھی بیج کے اندر کی منصوبہ بندی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آرکیٹیکٹ چھوٹے کاغذ پر بڑی بڑی عمارتوں کا نقشہ بنا دیتا ہے۔

کل زمین پر انار کا درخت تھا۔ آس پاس خوش نما گھاس تھی، کیاریوں میں پھول تھے۔ آج یہ زمین خالی، اجاڑ اور کانٹوں بھری بیج کیوں بن گئی ہے ــــ؟ جواب ملا کہ کسی نے بیج بویا تھا تعمیر مکمل کی تھی۔ کسی نے اس بیج کی پلاننگ سے بنی ہوئی بلڈنگ (درخت) کو گرا دیا۔

مجھے فوراً اپنی دادی اماں یاد آ گئیں، سرخ و سفید، پوپلا منہ، غلافی جھکی جھکی آنکھیں، گلاب پنکھڑی لب۔ یہ سب دماغ کی اسکرین پر ایسے نظر آئے کہ میں فلم دیکھ رہا ہوں۔ اس فلم میں، میں نے دیکھا کہ دادی اماں سفید کپڑے پہنے، سفید دھلے لٹھے کی چادر پر لیٹی ہوئی ہیں، منہ سے جھاگ اڑ رہے ہیں۔

میری ماں، ہائے! میری وہ ماں جس نے میرے اندر اپنا خون انڈیل کر مجھے پالا پوسا ــــ دادی اماں کے سرہانے بیٹھی کلمہ کا ورد کر رہی ہیں۔

میں نے پوچھا ماں! ماں! دادی اماں بولتی کیوں نہیں، تم رو کیوں رہی ہو ــــ؟ ماں نے بھیگتی آنکھوں سے دیکھا، میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دادی اماں کے جھریوں سے مزین خوب صورت چہرہ کو سفید ململ کے دوپٹے سے ڈھانک دیا۔

مجھے انار کا درخت پھر یاد آ گیا۔ کسی نے اسے بھی اس طرح ڈھانپ دیا ہوگا اس لئے تو وہ زمین کے اوپر نہیں ہے۔ انار کے دانہ کے بغیر درخت نہیں اگتا، اور آدمی کے بغیر آدمی نہیں اگتا۔ انار بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور آدمی بھی۔

اندر کے آدمی نے کہا، جس نے درخت لگایا تھا وہ خوش ذوق، حسن سلیقہ سے آراستہ تعمیر پسند تھا اور جس نے درخت کی حفاظت نہیں کی، درخت کو اس کے مادی وجود سے محروم کر دیا وہ تخریب پسند تھا۔ یہ بات ہرگز قابل تسلیم نہیں کہ درخت خود بخود لگ گیا اور خود بخود غائب ہو گیا۔

انار کے بیج میں پورا نقشہ موجود ہے، رنگ اور ذائقہ بھی موجود ہے مگر بیج کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ خود بخود درخت بن جائے، ذاتی وصف نہیں ہے۔

کوئی غیر مرئی طاقت ہے جس نے ایک بہترین معمار کی طرح انار کے اندر شاخوں، پتوں اور پھلوں کی ترتیب قائم کی۔ خود انار کے اندر اتنی قدرت نہیں کہ وہ خوش بو بن جائے اور اپنے وجود کو مختلف ذائقوں، مختلف رنگوں میں تقسیم کر دے۔

یہ منصوبہ کائنات کے خالق اللہ نے تیار کیا جو جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ اللہ نے کائناتی تخلیق میں ایک تخلیق انسان کو کائناتی منصوبہ کی تعمیر کے لئے معمار مقرر کیا۔ یہ وہی معمار ہے جس کو قرآن نے فی الارض خلیفہ کہا ہے۔

ع۔ح۔جمیل

توجہ

بعض اشخاص میں چند اشیا کی طرف متوجہ نہ ہونے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ اگر فرد پہلی دفعہ ریلوے اسٹیشن کے قریب سوئے تو گاڑی کی آواز سے نیند متاثر ہو جائے گی۔ یہی آواز اسٹیشن پر رہنے والوں کی نیند میں مخل نہیں ہوتی۔

قدیم ماہرین نفسیات نفس کا مطالعہ کرتے وقت توجہ کے عنصر کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ نفس کا تعلق احساس، جاننے اور خواہش سے ہے، توجہ کا اس میں دخل نہیں۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے ماہرین کے نزدیک توجہ شعور کی ایک حالت ہے۔

جو تصورات، خیالات اور احساسات — تجربات بنتے ہیں، ان کا موازنہ بہتی ہوئی ندی سے کیا جا سکتا ہے۔ فرد ایک وقت میں ندی کے اس حصہ کو دیکھتا ہے جو سامنے ہوتا ہے، دیگر رخ چوں کہ نظر نہیں آتے، اس لئے اس وقت نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فرد ایک وقت میں ایک رخ دیکھنے کا عادی ہے۔

اسی طرح دماغ میں خیالات کا ریلا آتا ہے لیکن فرد ایک خیال پر توجہ قائم کر کے اسے مرکز بنا لیتا ہے اور باقی خیالات بہتی ندی کی طرح گزر جاتے ہیں۔

اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔

فرض کریں کہ ہم آتش دان کے نزدیک بیٹھ کر مطالعہ میں محو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ نہ آگ کا احساس ہے نہ گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے اور نہ دیگر آوازوں کی طرف دھیان ہے۔ کوئی چیز مطالعہ میں مخل نہ ہونے کے باجود ہم سے منسلک اور ربط میں ہے۔ اچانک آگ سرد ہو جائے یا گھڑی کی آواز رک جائے یا ماحول پر سکوت طاری ہو جائے تو ہماری توجہ فی الفور اس طرف مبذول ہو جائے گی۔

وہ چیزیں جن پر اس خاص وقت میں ہماری توجہ نہیں، نفسیات دان انہیں ''شعور کا کنارا'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں جب کہ کتاب جسے پڑھنے میں ہم مصروف ہیں، اسے ''مرکز شعور'' کہتے ہیں۔

خیالات ہمیشہ کنارہ سے مرکز کی جانب اور مرکز سے کنارہ کی طرف آتے جاتے ہیں۔ یعنی جو چیز اس وقت زیر توجہ ہے، کچھ عرصہ بعد اس پر توجہ نہیں ہوگی، مگر وہ حافظہ میں موجود رہتی ہے۔ اور کسی بھی وقت کنارہ سے

سے مرکز میں آسکتی ہے۔

کنارہ کے تجربات کا روزمرہ کے واقعات سے گہرا تعلق ہے۔ کنارہ پر موجود خیالات ہمیشہ مرکز شعور میں آنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ گھڑی کی آواز ہم نہیں سن رہے لیکن ذرا سی توجہ سے ٹک ٹک بخوبی سن سکتے ہیں۔ خیالات یا تجربات شعور کے مرکز میں اس وقت تک نہیں آتے جب تک ہم خواہش نہ کریں یا ان پر ''توجہ'' نہ دیں۔ کوئی شے اس وقت مشاہدہ میں نمایاں ہوتی ہے جب اس پر توجہ دی جائے۔ بصورت دیگر نظر آنے یا سنائی دینے کے باوجود نظر انداز ہو جاتی ہے۔

ایسے بہت سے کلام ہیں جو ہماری زبان پر ہوتے ہیں، ایک وقت کے بعد ان کا مفہوم کھلتا ہے کہ اچھا اس شعر میں تو یہ بات کہی گئی ہے یا فلاں غزل کے مصرع کا مطلب یہ ہے۔ حالاں کہ وہ بات سادہ اور آسان ہوتی ہے، لیکن توجہ نہ ہونے سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے کہا جاسکتا ہے کہ توجہ شعور کے منتخب عمل کا نام ہے۔

بعض ماہرین نفسیات توجہ کو جبلی تجسس خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سیرت کی ذاتی شکل ہے اس لئے جبلی خیال کرنا درست ہے۔ بچہ کو ہم توجہ کرنا نہیں سکھاتے، یہ عادت اس کے اندر پہلے سے موجود ہے۔ گو بچہ کو ہم ایسی بہت سی چیزوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، جن کی طرف وہ فطری طور پر راغب نہیں ہوتا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ توجہ کا تعلق مخصوص حالت یا اشیا سے نہیں، ذہن سے ہے۔

توجہ کسی خاص عمل کا ردعمل ہے۔ کوئی شے فطرتاً توجہ مبذول کرتی ہے اور کوئی دیرینہ تجربات اور تعلیم کی وجہ سے۔ تاہم یہاں بھی توجہ کا تعلق ذہن سے ہی ہے۔

اس بات کو تفصیل سے سمجھتے ہیں۔

توجہ مبذول کرنے والے اوصاف یہ ہیں،

تغیر: ہر قسم کی تبدیلی اس کی بہترین مثال ہے۔ کمرے یا گلی میں یک دم سناٹا ہو جائے تو ہم فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز جس پر ہم غور نہیں کرتے، اگر اچانک رک جائے تو فوراً ہماری توجہ مبذول کرلے گی۔

مقدار اور حرکت تغیر کی قسمیں ہیں۔ مقدار یعنی زیادتی یا کمی اور حرکت یعنی حالت تغیر۔ ماحول میں سناٹے کے بعد شور وغل ہونا، ہوا کا اچانک متعفن یا خوش بودار ہونا اور کرسی، میز یا کھڑکی کا کسی سبب سے حرکت کرنا، اس کی مثالیں ہیں۔

تکرار: اس کی خاص مدت ہوتی ہے۔ اگر اس مدت سے گزر کر عمل یا محرک بار بار کوئی ردعمل پیدا کرے تو ہماری توجہ مبذول نہیں کرسکے گا۔ فقیر کا بار بار آکر صدا دینا ابتدا میں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد اپنی خاصیت کھو دیتا ہے۔

پسندیدہ صفت: بعض احساسات میں توجہ مبذول کرنے کی زیادہ خاصیت ہوتی ہے۔ توجہ کے لئے گہرا

رنگ ہلکے رنگ کی نسبت زیادہ موزوں ہے۔ باغ میں خوش نما پھولوں پر فوراً نظر پڑتی ہے کیوں کہ ان میں کشش کی خاص صفت موجود ہوتی ہے۔

صفت معین: موسیقی کا نغمہ عام آوازوں کی نسبت متوجہ کرنے کا زیادہ اہل ہوتا ہے۔ اگر کسی جگہ سے موسیقی کی آواز آرہی ہو تو لوگ ماحول میں موجود دیگر آوازوں کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ کان موسیقی کی صدا پر لگے ہوتے ہیں، چاہے خوشی سے یا جھنجھلاہٹ میں۔ دیہات میں یہ صفت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔

بیان کی گئی صفات ذاتی ہیں۔ ان میں اکتساب کی ضرورت نہیں۔

اب ہم باقی صفات پر غور کرتے ہیں جو تعلیم اور تجربات کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہیں اور مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہیں۔

آدمی جب اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ کن باتوں یا چیزوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے تو اس عمل سے گزر کر وہ اپنے اندر ان چیزوں کے لئے ''توجہ کی عادت'' ڈال لیتا ہے۔

بعض اشیا کی طرف متوجہ ہونا ہماری عادت پر منحصر ہے۔ یعنی ہم میں خاص چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی خود بخود عادت پڑ جاتی ہے۔ عادت فائدہ اور ضرورت پر مبنی ہوتی ہے۔ ڈرائیور کے لئے سپاہی کی سیٹی کی آواز اور اس کے اشاروں پر متوجہ ہونا لازمی ہے۔ یہی چیزیں گاڑی نہ چلانے والا نظر انداز کر دیتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر کوئی مسافر تار کی ٹک ٹک پر غور نہیں کرتا لیکن تار بابو کا فرض ہے کہ اس آواز کا خیال رکھے۔ گھنٹے کی صدا جو طالب علموں کو اپنی طرف کھینچتی ہے، راہ گیروں پر اثر نہیں کرتی۔ کھانے کی خوش بو، بھوکے کو بے چین کر دے گی لیکن جس کا پیٹ بھرا ہوا ہے اس پر چنداں اس خوش بو کا اثر نہیں ہوتا۔

بعض اشخاص میں چند اشیا کی طرف متوجہ نہ ہونے کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ اگر فرد پہلی دفعہ ریلوے اسٹیشن کے قریب سوئے تو گاڑی کی آواز سے نیند متاثر ہو جائے گی۔ یہی آواز اسٹیشن پر رہنے والوں کی نیند میں مخل نہیں ہوتی۔

توجہ کا قاعدہ ہے کہ جس سے سابقہ پڑنا ضروری ہے وہ ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس اس شے میں جس سے ہمیں واسطہ نہیں، یہ صفت مفقود ہوتی ہے۔

چند اشیا کا ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لینا ہمارے وقتی فائدہ اور خواہش پر منحصر ہے۔ خریداری کے لئے بازار جائیں تو زیادہ تر وہی چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے جو ہم خریدنا چاہیں۔ اگر ہمیں کسی سے نفرت ہے تو ہم اس کے عیوب پر نگاہ رکھیں گے۔ اس کے برعکس محبوب کی منفی باتیں نظر انداز اور صفات اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ وقتی خواہش کی وجہ سے متوجہ ہونا آسان ہے۔

شکل نمبر۱

الف ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ب

ج ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ د

شکل نمبر۲

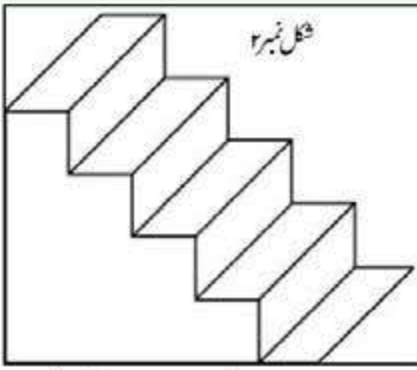

توجہ کے جسمانی پہلو بھی ہیں۔

عام طرز عمل: چوں کہ توجہ کسی محرک کا ردعمل ہے اس لئے ہم طرز عمل یعنی حرکات وسکنات سے جان سکتے ہیں کہ آدمی اس وقت متوجہ ہے۔

جلسہ میں مقرر کی تقریر سنتے ہیں تو اس کا چہرہ حاضرین کی نگاہوں کا مرکز اور کان آواز پر لگے ہوتے ہیں۔ جسم ساکن ہوتا ہے لیکن ذرا آگے کو جھکا ہوا۔ سانس آہستہ آہستہ آتی جاتی ہے۔ جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی ہوتی ہے وغیرہ۔ یہ ایسی علامات ہیں جو اس وقت تمام حاضرین میں بشرطے کہ وہ متوجہ ہوں، موجود ہوتی ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے، کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یا محبوب کا خیال آتا ہے تو کم وبیش یہی کیفیات ہوتی ہیں۔

اصلاح عضوحس: توجہ میں آنکھوں سے مدد لی جارہی ہو تو آنکھیں اس چیز پر جمی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھوں کی پتلی روشنی کی مقدار کے مطابق چھوٹی بڑی ہوتی رہتی ہے۔ آنکھ اندرونی عضلات کی مدد سے اس چیز کے فاصلہ کے موافق اپنی حالت تبدیل کرتی ہے۔ دونوں آنکھیں اس طرح مطابقت اختیار کر لیتی ہیں کہ اس چیز کا عکس ہر آنکھ کے پردہ کے سب سے حساس حصہ یعنی زرد نقطہ پر پڑے۔ آنکھیں نیچے اوپر اور دائیں بائیں اس طرح حرکت کرتی ہیں کہ روشنی زرد نقطہ پر بخوبی پڑ سکے۔ آنکھوں کی ان حرکات اور مطابقت سے فرد مطلوبہ شے دیکھ لیتا ہے۔

۱۔ توجہ کے دوران آنکھیں کسی چیز پر جماتے ہیں تو چند سیکنڈ کے بعد نگاہ اچھل کر اس چیز کے دوسرے حصہ پر پڑتی ہے۔ نگاہ کے سامنے اچانک تیز شعاع گزاری جائے تو نگاہ پہلی چیز سے ہٹ کر فوراً شعاع کو مرکز بنالے گی۔ یہ حرکت متواتر اور سیدھی نہیں ہوتی۔

۲۔ آنکھ کی حرکت کی ایک اور قسم ہے۔ اگر نظر ایسی چیز پر ہے جو آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے تو آنکھیں بھی حرکت کرتی ہوئی شے کا آہستہ آہستہ تعاقب کرتی ہیں۔ آنکھوں کی اس حرکت کا نام ''حرکت تعاقب'' ہے۔ اس کا مشاہدہ اس وقت کیا جاسکتا ہے جب فرد

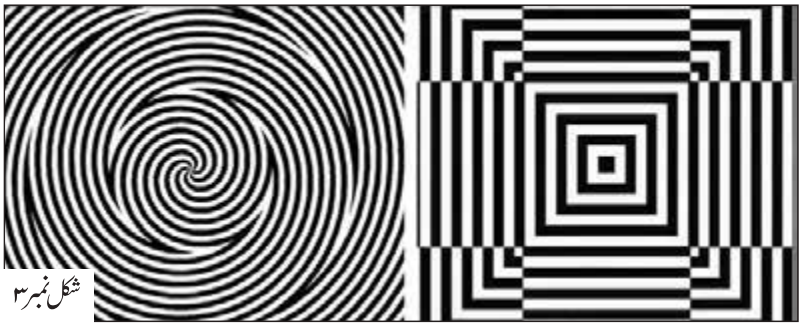

شکل نمبر۳

آسمان پر ہوائی جہاز کی حرکات دیکھ رہا ہو۔

پڑھتے وقت نگاہیں پہلی قسم کی حرکت کرتی ہیں۔ وہ ہر ایک سطر کا شروع سے آخر تک کا فاصلہ کود کود کر طے کرتی ہیں نہ کہ تسلسل میں۔ اسی طرح وہ ایک سطر سے دوسری سطر پر کود کر پہنچتی ہیں۔

شکل نمبر(۱) اس حرکت کو ظاہر کرتی ہے۔

الف ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ب ج

نگاہ الف سے ب تک پہنچنے کے لئے بالکل سیدھی نہیں جاتی بلکہ الف سے (۱) پر، (۱) سے (۲) پر، (۲) سے (۳) پر اور (۳) سے (۴) پر — یہاں تک کہ ب پر پہنچے گی۔ (۱) سے (۲) اور (۲) سے (۳) تک کا فاصلہ نہیں طے کرے گی بلکہ (۱) سے (۲) پر کود کر پہنچے گی۔ اور پھر ب سے کود کر ج (دوسری سطر) پر پہنچے گی۔

ماہرین نفسیات اس نظریہ کو کہ توجہ جبلی تجسس ہے، آنکھوں کی مذکورہ حرکات سے واضح کرتے ہیں۔ اصول سب کا یہی ہے کہ ایک ساکن چیز پر چند سیکنڈ سے زیادہ نگاہ قائم رکھنا ممکن نہیں۔

اب دیگر تجربات اور مبہم اشکال پر غور کیجئے جو اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ سفید کاغذ پر نشان لگا کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ کس طرح وہ لفظ غائب ہوتا ہے اور کبھی ظاہر۔ نیز اس پر متواتر غور کتنا مشکل ہے۔

۲۔ شکل نمبر(۲) میں زینہ کو ملاحظہ کرنے سے بھی یہ نقل و حرکت سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نیچے کو دیکھ رہے ہیں۔ پھر کچھ سیکنڈ کے لئے لگتا ہے کہ گویا ہم نیچے سے اوپر کو دیکھ رہے ہیں۔

۳۔ شکل نمبر(۳) کو غور سے دیکھیں۔ کبھی یہ نشانات گروہوں میں تقسیم ہوں گے اور کبھی سیدھے نظر آئیں گے اور کبھی ترچھے۔

دوچشمی مزاحمت: اس میں ایک رنگ ایک آنکھ کے سامنے رکھا جاتا ہے اور دوسرا رنگ دوسری آنکھ کے سامنے۔ مثال کے طور پر سرخ رنگ کا شیشہ ایک آنکھ کے قریب رکھیں۔ اور نیلے رنگ کا شیشہ دوسری آنکھ کے۔ دونوں آنکھوں سے چمک دار سطح کو دیکھیں۔

کچھ وقت کے لئے رنگ سرخ نظر آئے گا اور کچھ

وقت کے لئے نیلا۔اور یہ عمل خود کو دہرائے گا۔

تموج* توجہ : دور سے کسی نغمہ کی آواز سنیں تو تھوڑی دیر کے بعد چند سیکنڈ کے لئے ہم اس نغمہ کو سن نہیں سکیں گے۔لیکن کچھ لمحے گزرنے کے بعد ہم ایک بار پھر سننے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر گھڑی تھوڑے فاصلہ پر رکھی جائے تو اس کی ٹک ٹک کی آواز آئے گی، نہیں آئے گی اور یہ چکر خود کو دہراتا رہے گا۔سفید کاغذ پر نہایت ہلکے رنگ کا دھبا لگا کر غور کریں تو وہ دھبا کبھی ہمیں نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا۔

عام افراد میں تموج ہر پانچ یا چھ سیکنڈ کے بعد واقع ہوتا ہے۔اس کی کم ترین میعاد تین سیکنڈ ہے۔سب سے زیادہ میعاد 25 سیکنڈ ریکارڈ کی گئی ہے۔

تموج میں جب توجہ کچھ عرصہ بعد کسی اور چیز کی طرف منتقل ہوتی ہے تو پہلی چیز غائب ہوجاتی ہے یہی حالت مبہم اشکال کو غور سے دیکھنے کی ہے۔ایک دفعہ دیکھنے سے جو حالت نظر آتی ہے کچھ وقت کے بعد تبدیل ہوجاتی ہے لیکن جب ہم دل فریب منظر کو دیکھتے ہیں تو توجہ کچھ عرصہ کے لئے ہٹ کر پھر پلٹ آتی ہے۔اس صورت میں اشیا مرکز توجہ سے ہٹ کر کنارے پر چلی جاتی ہیں اور کنارہ سے واپس مرکز میں آتی ہیں۔

توجہ سے متعلق دیگر عناصر کی تفصیل اگلے ماہ پڑھئے۔

*تموج = کمی بیشی، اتار چڑھاؤ

ذوق کیا ہے ــــ؟

★ ذوق میں نہ وزن ہوتا ہے، نہ ذوق کے لئے فاصلہ کوئی معنی رکھتا ہے۔نہ ذوق زمین آسمان کی حدود کا پابند ہے نہ اسے وقت پابند بنا سکتا ہے۔یہی ذوق چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان اس سے اس وقت تک متعارف نہیں ہوتا جب تک اس سے تعارف حاصل نہ کرے۔ جب تعارف حاصل کرلیتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہی ذوق انسان ہے۔ یہ پوری کائنات میں آزاد ہے۔فرشتوں کا سربراہ ہے۔ اللہ کی بہترین صنعت ہے اور کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔نہ وہ پیروں سے چلنے اور ہاتھوں سے پکڑنے کا پابند ہے۔نہ وہ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا محتاج ہے۔ یہ ساری خرافات انسان نے آپ ہی تخلیق کی ہیں اور آپ ہی ڈھول بجاتا پھرتا ہے کہ ہائے میں تو بالکل مجبور ہوں۔

★ جس کا نام زید ہے وہ اس ہی ذوق کا پیٹرن (طرز، Pattern) ہے۔کوئی پیٹرن ساکت و صامت پنجرہ نہیں بلکہ بولتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوچتا سمجھتا انسان ہے۔فرش سے عرش تک اس کا ایک قدم ہے۔سوئی کا روزن اور آسمانوں کی کھلی فضا، ایک ستارہ سے دوسرے ستارہ تک کا فاصلہ اس کے لئے ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ وہ نہ کہیں رکتا ہے، نہ کھٹکتا ہے۔افسوس یہ ہے کہ وہ خود کو جانتا نہیں کہ میں کیا ہوں اور کائنات کیا ہے۔

شاہد خان
(متحدہ عرب امارات)

لاشعوری جہاں

آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ کثرت سے ذہن ہٹا کر ایک نکتہ پر یک سو ہوسکتا ہے اور دنیا سے اس طرح گزر ے جیسے بازار سے گزرتا ہے۔

دن رات میں نظر سے مختلف مناظر گزرتے ہیں، کچھ دل نشین اور لطیف محسوس ہوتے ہیں جب کہ بعض مناظر میں دل کشی کے باوجود ذہن بھاری ہوجاتا ہے۔

کوئی منظر ہلکا یا بھاری کیوں محسوس ہوتا ہے—؟

سیر کے دوران چھوٹے مکان کے پاس سے گزرا تو ذہن پر خوش نما تاثر ابھرا۔ تھوڑا آگے جا کر بلند و بالا عمارت نظر آئی جو فن تعمیر کا شاہ کار اور پر تعیش زندگی کی نشان دہی کررہی تھی۔ لیکن رعنائیوں کے باوجود عمارت کو دیکھ کر ذہن پر دباؤ محسوس ہوا۔

میں چھوٹے مکان میں داخل ہوا نہ بڑی عمارت میں، پھر دونوں کا تاثر مختلف کیوں تھا—؟

مناظر سے متعلق اطلاع دراصل تعارف ہے اس شے کا جس کی طرف ہم متوجہ ہوئے۔ ہر شے اپنے اندر معلومات کے ذخیرہ کو تفصیلات کے ساتھ دیکھنے والے کے اندر منتقل کرتی ہے اور ناظر اسے اپنی طرز فکر کے مطابق دیکھتا ہے۔

بڑی عمارت کے سامنے سے گزرنے پر ذہن کے بھاری ہونے کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ فرد خود کو اس عمارت کے اندر دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ وہاں نہیں، باہر ہے۔ یعنی خواہش کہ کاش پر تعیش زندگی مجھے بھی حاصل ہو۔ اس تاثر سے نکلنے میں وقت لگتا ہے۔ صحیح راہ نمائی نہ ہو تو زندگی اس طرز فکر میں گزر جاتی ہے۔

۲۔ ایک طرز فکر یہ بھی ہے کہ فرد جب زندگی کی چکاچوند سے باخبر ہوتا ہے تو توجہ باطن میں یک سو ہوجاتی ہے۔ ایسے میں ظاہر کی طرف متوجہ ہونے سے ذہن پر مادیت کا بوجھ محسوس کرتا ہے اور وہ اس تاثر سے فوراً نکلنا چاہتا ہے۔

بوجھ دونوں صورتوں میں ہے لیکن ذہن مختلف ہے۔ کسی شے کو دیکھ کر ذہن اس وقت بھاری ہوتا ہے جب ہم اس کا اپنے آپ سے موازنہ کرتے ہیں۔ اگر پہلا شخص یہ سوچ لیتا کہ جو لوگ اس عالی شان عمارت میں رہتے ہیں، اللہ ان کے رزق اور زندگی میں برکت دے، اور یہی دعا وہ اپنے لئے بھی کرے تو اب عمارت

کو دیکھ کر ذہن بھاری نہیں ہوگا، کیوں کہ اس نے باطنی زندگی کو اہمیت دی ہے اور خود سمیت مخلوقات کو اللہ سے منسوب کیا ہے۔

اسی طرح چھوٹے مکان کو دیکھ کر ذہن بھاری نہ ہونے کی بھی وجوہات ہیں۔

۱۔ ہم نے مکان میں رہنے والوں سے اپنے طرز زندگی کا موازنہ کیا اور یہ سوچ کر کہ ان کا اور ہمارا طرز زندگی ایک ہے، یا ہمارا ان سے بہتر ہے، ذہن ہلکا رہا۔ بالفاظ دیگر کم تر یا برابر سمجھ کر اس کے تاثر کو قبول نہیں کیا۔

۲۔ ایک طرز فکر یہ بھی ہے کہ فرد نے چھوٹے مکان کو نہیں، اپنے اندر سکون کو دیکھا۔ مکان تو مکان ہے، چھوٹا ہو یا بڑا، اس میں پانچ افراد ہوں یا زیادہ، دیکھنے والا جس نظر سے دیکھتا ہے، اس کے تاثرات اندر منتقل ہوتے ہیں۔ تجربہ سکھاتا ہے کہ آدمی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کثرت سے ذہن ہٹا کر ایک نکتہ پر یک سو ہوسکتا ہے اور دنیا سے اس طرح گزرے جیسے بازار سے گزرتا ہے۔

کسی شے کو دیکھنا اس میں موجود معلومات کو اپنے اندر منتقل کرنا ہے۔ جب میں نے بلند و بالا عمارت دیکھی، عمارت کی بناوٹ سے لے کر اندر قیام پذیر لوگ، سب کا data میرے اندر منتقل ہوگیا۔ اگر عمارت بیس منزلہ ہے، ہر منزل پر پانچ اپارٹمنٹ ہیں اور ہر اپارٹمنٹ میں پانچ افراد ہیں تو مجموعی طور پر عمارت میں سو خاندانوں کی معلومات لاشعوری طور پر منتقل ہوئیں۔ فرد کو معلوم نہیں ہوتا کہ اندر کتنے لوگ رہتے ہیں۔ جب وہ عمارت کی تفصیلات پر غور کرتا ہے تو ذہن پر دباؤ محسوس ہوتا ہے یعنی وہ خود کو مغلوب کر کے عمارت کے تاثر کو اپنے اندر نمایاں کر رہا ہے۔

اگر ہم عمارت سے متاثر ہوتے ہیں جو کچھ اس کے اندر ہے، اس کا دباؤ محسوس ہونا شروع ہوتا ہے۔ دباؤ کی مقدار کا تعلق اندر رہنے والے لوگوں اور گھروں کی تعداد سے نہیں، توجہ سے ہے۔ توجہ جتنی زیادہ ہوگی، ذرّہ کا وزن پہاڑ جتنا محسوس ہوگا۔ توجہ کم ہوگی تو پہاڑ ذرّہ برابر ہوجائے گا۔ یعنی فرد متاثر نہ ہو تو عمارت کو دیکھ کر بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔

''تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو اور سمجھتے ہو کہ جمے ہوئے ہیں، یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔'' (النمل:۸۸)

ہم روزمرہ معمولات میں موبائل یا کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں تو بیک وقت مختلف پروگرامز اور متعدد ونڈوز (windows) کھولتے ہیں۔ پھر ایک دم کسی اور خیال کے ساتھ نئی ونڈو کھول کر پرانی کو بند کئے بغیر کام شروع کر دیتے ہیں۔

کمپیوٹر یا موبائل سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ جس پروگرام یا ایپلی کیشن کو بند نہ کیا جائے، اس کی معلومات پس منظر میں چلتی رہتی ہیں۔

پروسیسر کے مستقل اور غیر معمولی استعمال کے باعث

اسے حرارت کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر کمپیوٹر میں پنکھا نصب ہوتا ہے۔ اکثر لوگ پروگرام کی تمام جزئیات سے ناواقفیت کی وجہ سے صرف دو سے دس فی صد صلاحیت استعمال کرتے ہیں مگر پروگرام مکمل جزئیات کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ یعنی جو شے پروگرام کا حصہ بن جائے، وہ ریکارڈ میں محفوظ ہوجاتی ہے اور پس منظر میں چلتی رہتی ہے، جب توجہ دی جائے تو نمایاں ہوجاتی ہے۔ اس لئے ایسی چیزوں اور عادتوں کو زندگی کا حصہ بنائیں جن سے نقصان نہ ہو۔

روحانی علوم ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھنے کی عمومی طرز یہ ہے کہ ہم شے کو نہیں، شے کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔ کسی چیز کو دیکھ کر حسرت پیدا ہو تو اب حسرت کی نگاہ کام کرتی ہے، حسد پیدا ہو تو حسد کی خصوصیات نگاہ میں شامل ہوجاتی ہیں، تقابل پیدا ہو تو موازنہ کرنے کی نگاہ متحرک ہوتی ہے، ناخوشی سے ہر شے میں ناخوشی نظر آتی ہے۔ یہی صورت شکر، صبر، محبت اور خوشی کی ہے۔ توجہ مادیت پر ہوگی، تو مادی خصوصیات ہماری نظر بنتی ہیں۔ اور ذہن مادہ کی بساط پر مرکوز ہو تو باطنی نگاہ کام کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں وزن رکھتی ہیں۔ وزن کا تناسب وقت سے ہے۔

''عمل کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب عمل کرنے کا وقت اور جگہ کا تعین کرلیا جائے۔ کسی کام کا خیال دماغ میں آتا ہے تو اس خیال کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے۔ مثلاً شک کی صورت ایک الجھے ہوئے جال جیسی ہوتی ہے۔ آدمی اگر جال میں پھنس جائے تو نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ آدمی جتنا جال سے نکلنا چاہتا ہے جال مزید الجھ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم لطیف انوار کا ذخیرہ ہے۔ جب کہ ناسوتی کثیف روشنیاں عملی راستہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ شیطان کھلا دشمن ہونے کی وجہ سے آدمی کے نفس کو کثافت سے بھر دیتا ہے۔ نفس (مٹی کے عناصر کا مرکب) میں شک، وسوسہ، غرور و تکبر، حسد، نافرمانی اور غیر اخلاقی باتیں آتی رہتی ہیں۔ نفس دو راستوں پر سفر کرتا ہے۔ ایک ناسوتی، دوسرا غیبی دنیا کا راستہ۔ ناسوتی دنیا میں شیطان وسوسے ڈالتا ہے اور شیطان کی انسپائریشن حکم الٰہی اور انسانی عقل کے درمیان شک بن جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شیطان کو کنکریاں مارنا شیطانی انسپائریشن کو رد کرنا ہے۔'' (کتاب: احسان وتصوف، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان)

خواہشات کی اس دنیا میں ذہن پر اشیا کے ہجوم (دباؤ) سے ہنگامہ برپا ہے۔ یہ دباؤ خوف، اندیشوں، بے یقینی اور حسد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اکثر خواتین وحضرات ذہنی تناؤ یا اسٹریس کی وجہ سے گردن سے نیچے کندھوں پر دباؤ محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ کمپیوٹر کی طرح جو پروگرام انہوں نے اندر محفوظ کرلئے ہیں اور انہیں بند نہیں کیا، وہ سب متحرک ہیں۔ دماغ کے سرچ انجن میں پریشانی کا بٹن دبے گا تو اندر

موجود ہر اس شے کو تحریک ملے گی جس میں پریشانی ہے۔اسی طرح سرچ انجن پرسکون لکھیں گے تو ہر وہ شے حرکت میں آئے گی جس میں سکون ہے۔

جس طرح عمارت کے تاثر کو قبول کرنے سے ریکارڈ ذہن میں محفوظ ہوجاتا ہے، اسی طرح زمین پر آنے سے پہلے جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، وہ لاشعور میں محفوظ ہے اور لاشعور لوح محفوظ کا عکس ہے۔فرد اپنے مطلب کی معلومات پر ذہن مرکوز کرتا ہے، اس دوران دیگر اطلاعات دائرہ میں گردش کرتی رہتی ہیں۔

باطنی علوم کے ماہرین فرماتے ہیں کہ ''فرد سات ارب آدمیوں کے شعور کے دباؤ میں رہتا ہے۔''

ہم نسل در نسل، روایت در روایت اندھی تقلید میں زندگی گزار رہے ہیں۔ہر پیدا ہونے والے شخص کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ پہلے خود پڑھ لکھ کر بڑا ہونا، پھر بہتر معاش حاصل کر کے شادی خانہ آبادی کے بعد یہ سوچ اپنے بچوں میں منتقل کر دینا۔اس کوشش میں وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔وسائل کا حصول شکرانۂ نعمت ہے لیکن وسائل کو زندگی سمجھ لینا، کفران نعمت ہے۔

تحریر کا مقصد اہم نکتہ کی جانب متوجہ کرنا ہے کہ آدمی کے ذہن میں دانستہ اور غیر دانستہ طور پر اطلاعات کا لامحدود ذخیرہ ہے۔اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اطلاع کہاں سے آتی ہے اور ذہن کی دنیا کہاں ہے ــــ؟ ان ذخائر کو استعمال کر کے وہ غم و آلام سے نکل سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسان کی اس حالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے،

''قسم ہے عصر کی بے شک انسان خسارہ میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور جنہوں نے آپس میں حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔'' (العصر:۱۔۳)

انسان کو خسارہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تلقین کی جارہی ہے کہ وہ ذرائع تلاش کئے جائیں جن کے حصول کے بعد فرد میں اسفل سے پرواز کی توانائی پیدا ہوتی ہے۔بے شک وہ توانائی اللہ سے قربت ہے۔

غم سے دور اور خوشی سے قریب رہنا ہر فرد کی خواہش ہے۔طریقہ سنت رسولؐ پر عمل ہے۔ارشاد باری ہے،

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھادو اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔دن کے اوقات میں تو تمہارے لئے بہت مصروفیات ہیں۔اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے رہو۔'' (المزمل:۱۔۸)

اس فرمان پر عمل کر کے ہم ذہن میں ہجوم سے دور ہو کر لاشعور سے واقف ہو سکتے ہیں۔

دل میں کھڑکی

دل جب تک حواس خمسہ میں مشغول رہتا ہے، عالم غیب سے مطابقت نہیں ہوتی۔ نیند میں حواس خمسہ مغلوب ہوتے ہیں تو فرد عالم روحانی کو دیکھتا ہے۔

اے عزیز! اگر تجھے خود کو جاننا ہے تو پھر یہ بات جان لے کہ اللہ نے تجھے دو چیزوں سے پیدا کیا ہے۔ ایک ظاہری ڈھانچا ہے جسے بدن کہتے ہیں۔ بدن کو ظاہری آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرا باطن ہے کہ اس کو دل اور جان کہتے ہیں، اسے فقط باطن کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہی باطن تیری حقیقت ہے۔ ہر شے اس کے تابع اور خدمت گار ہے اور باطن کی اسی حقیقت کو ہم دل کہتے ہیں۔

ہم جب دل کی بات کرتے ہیں تو اے عزیز! جان لے کہ دل سے مراد حقیقتِ انسان ہے۔ ہم اس حقیقت کو کبھی روح کہتے ہیں اور کبھی نفس۔ دل سے ہمارا مقصود گوشت کا لوتھڑا نہیں جو سینہ میں بائیں طرف موجود ہے۔ گوشت کا یہ لوتھڑا تو جانوروں اور مردوں کے اندر بھی ہوتا ہے۔ دل جو حقیقتِ انسان ہے، اسے ظاہر آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ جو چیز ظاہری آنکھ سے دکھائی دے وہ عالم شہادت یعنی اِس عالم سے ہے۔

جب کہ جس دل کی ہم بات کر رہے ہیں، اس کی حقیقت اِس عالم سے نہیں۔ البتہ وہ اِس عالم میں مسافر کی طرح آیا ہے۔ وہ بدن کا بادشاہ اور افسر ہے۔ اس ''دل'' کی صفت اللہ کی معرفت اور اس کے جمال بے مثال کا مشاہدہ ہے۔

اے عزیز! ایسی کوشش کر کہ تو ''دل'' کو پہچانے کہ وہ ایک عمدہ گوہر ہے اور گوہر ملائکہ کی جنس سے ہے۔ دربار الوہیت اس کا اصلی معدن ہے، وہیں سے وہ آیا ہے اور وہیں چلا جائے گا۔

اے عزیز! یہ سمجھ لے کہ جب تک تو دل کی ہستی کو نہیں جانے گا، اس کی حقیقت کو کیا پہچانے گا۔ پہلے ہستی پہچان، پھر حقیقت جان! اس کے بعد دل کا لشکر معلوم کر کہ کیا ہے۔ پھر یہ سمجھ کہ دل کو اس لشکر سے کیا تعلق ہے۔ پھر اس کی صفت پہچان کہ اللہ کی معرفت اسے کیسے حاصل ہوتی ہے اور معرفت سے یہ سعادت کو کیسے پہنچتا ہے۔ دل کی ہستی اس کے ظاہری ڈھانچے سے نہیں، اس لئے کہ یہ بدن مردہ ہے۔ دل

سے ہمارا مقصود روح کی حقیقت ہے۔ روح جب نہ رہی، بدن مردار ہے۔ اگر کوئی آنکھ بند کرے اور اپنے خاکہ اور دنیا و مافیہا کو، جسے آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، بھلا دے تو اپنی ہستی کو ضرور پہچان لے گا۔

''یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں کہو، روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔'' (بنی آسرآءیل: ۸۵)

روح کیا ہے ــــ؟ اللہ کے کاموں اور عالم امر سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔''

(الاعراف:۵۴)

عالم خلق جدا ہے اور عالم امر الگ۔ جس چیز میں ناپ، مقدار اور کمیت کا دخل ہو، اسے عالم خلق کہتے ہیں اس لئے کہ لغت میں خلق کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔ اور ''دل'' کے لئے اندازہ نہیں ہے، اسی لئے تقسیم قبول نہیں کرتا۔ روح جہاں عالم خلق سے ہے، وہاں عالم امر سے بھی ہے۔

عالم قلب کے عجائبات کی انتہا نہیں، پھر جس دل کی ہم بات کر رہے ہیں، اس کا کیا بیان ہو! یہ سب سے نرالا ہے۔ بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں۔

دل کی فضیلت کی دو وجوہات ہیں۔

★ علم کی وجہ سے

★ قدرت کے سبب

علم کی وجہ سے فضیلت کی دو قسمیں ہیں۔

★ ایک کو تمام مخلوق جان سکتی ہے

★ دوسری مخفی اور عمدہ ہے

جو ظاہر ہے وہ تمام علوم، صنعتوں اور معرفتوں کی قوت ہے۔ اسی قوت کی وجہ سے دل ہر شے سے واقف ہے، اور جو کچھ کتابوں میں ہے اسے پڑھتا اور جانتا ہے جیسے ہندسہ، حساب، طب، نجوم، علم شریعت۔

دل ایسی چیز ہے کہ ٹکڑے نہیں ہوتا اور طرح طرح کے علوم اس میں ایک جگہ سما جاتے ہیں۔ اس کے سامنے تمام عالم ایسا ہے کہ گویا صحرا میں ذرّہ۔ ایک لحظہ میں زمین سے آسمان، مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک فکر و حرکت سے پہنچ جاتا ہے۔ زمین پر ہے مگر آسمانوں تک رسائی ہے، زمین سے ستاروں کو ناپ لیتا ہے کہ کتنے فاصلے پر ہیں۔ یہ سب پانچ حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ حواس کا راستہ دل کی طرف ہے۔ تعجب ہے کہ جس طرح عالم جسمانی کی طرف پانچ حواس دل کے پانچ دروازے ہیں، اسی طرح عالم ملکوت یعنی عالم روحانی کی طرف بھی دل میں ایک کھڑکی کھلی ہے۔

بہت سے لوگ عالم جسمانی کو محسوس جانتے اور صرف حواس ظاہری کو علم کا راستہ سمجھتے ہیں حالاں کہ یہ دونوں بے حقیقت اور بے اصل ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے اور دل کی بہت سی کھڑکیاں جو علوم کی طرف

کھلتی ہیں، اس پر تین دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ نیند میں لوگوں کے ظاہری حواس بند ہوجاتے ہیں، دل کی کھڑکی کھلتی ہے اور عالم ارواح ولوح محفوظ میں غیب کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے دکھائی دیتا ہے یا صاف معلوم ہوتا ہے یا پھر مثال* میں نظر آتا ہے اور اسے تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

خواب کی حقیقت کی تفصیل کا بیان یہاں ممکن نہیں لیکن اس قدر جان لینا چاہئے کہ دل آئینہ کی مانند ہے اور یہ آئینہ لوح محفوظ کا ہے جس میں موجودات کی تصویریں ہیں اور صاف نظر آتی ہیں۔

۲۔ دل جب تک حواس خمسہ* میں مشغول رہتا ہے، عالم غیب سے مطابقت نہیں ہوتی۔ نیند میں حواس خمسہ مغلوب ہوتے ہیں تو فرد عالم روحانی کو دیکھتا ہے۔ مگر غور طلب ہے کہ نیند میں حواس خمسہ علیحدہ ہو جاتے ہیں لیکن خیال باقی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے مثال میں خیال نظر آتا ہے، اور حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ اور جب آدمی خود کو سپرد کر دیتا ہے تو خیال باقی رہتا ہے نہ حواس فاصلہ بنتے ہیں — معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس سے کہا جاتا ہے،

''اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔'' (قٓ: ۲۲)

اور وہ جواب دیتا ہے،

''اے رب ہم نے دیکھ لیا، سن لیا، اب ہم کو پھر بھیج ہم کریں بھلائی ہم کو یقین آیا۔'' (السجدۃ:۱۲)

۳۔ عالم ملکوت کی طرف دل کی کھڑکی ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے دل میں فراست کی باتیں اور نیک خیالات الہام نہ ہوتے ہوں۔ وہ حواس خمسہ کے راستے نہیں آتے بلکہ دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہئے کہ علوم کا تعلق روحانی عالم سے ہے۔ حواس جن کو اس عالم کے لئے پیدا کیا ہے، اس عالم کو دیکھنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ رکاوٹ دور ہوگی تو حواس کی حقیقت روشن ہوجائے گی۔ طریقہ یہ ہے کہ حواس جہاں سے آتے ہیں، اس راستہ کو تلاش کر اور پھر خلوص نیت سے گامزن ہوجا۔

اے عزیز! روحانی عالم کی طرف دل کی کھڑکی سوئے اور مرے بغیر نہیں کھلتی۔ اگر کوئی شخص جاگتے میں ریاضت ومحنت کرے، خود کو خود غرضی اور غصہ سے پاک کرے، برے اخلاق سے دور ہو، خالی الذہنی کی کوشش کرے، آنکھ کو بند اور حواس کو مغلوب کردے، قلب سے اللہ اللہ کہے یہاں تک کہ فرد خود سے اور تمام عالم سے بے خبر ہوجائے، ہر شے میں ''اللہ ھو'' نظر آئے۔

جب ایسا ہو تو نیند کے علاوہ بیداری میں بھی دل کی کھڑکی کھل جاتی ہے۔ جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے، وہ بیداری میں نظر آتا ہے۔ مقدس ہستیوں کی زیارت ہوتی

---

* مثال (عالم برزخ) *حواس خمسہ (پانچ بنیادی حواس — سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا، بات کرنا)

ہے اور ان سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ ملائکہ ارضی وسماوی نظر آتے ہیں۔ جس کسی پر یہ راہ کھلی، وہ زمان ومکان میں عجائبات دیکھتا ہے۔ رسول مقبولؐ نے فرمایا،

''دکھائی گئی مجھ کو زمین پھر دیکھا میں نے اس کی مشرقوں اور مغربوں کو۔'' (ترمذی، طبرانی)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے،

''ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین وآسمان کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔'' (الانعام: ۷۵)

انبیا علیہم السلام کے علوم کا تعلق باطن سے ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے،

''اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ (المزمل: ۸)

دنیا کی تدبیر میں مشغول نہ ہوں کہ اللہ خود سب کام درست کر دیتا ہے۔

''وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنالو۔ اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔'' (المزمل: ۹۔۱۰)

کوئی لوہا ایسا نہیں کہ خلقت میں اس کی لیاقت نہ رکھتا ہو، اس سے آئینہ نہ بن سکے کہ اس میں عالم کی صورت نظر نہ آئے۔ یہ اور بات ہے کہ زنگ لگنے سے اصل چھپ جائے۔ پھر تصویر نظر نہیں آتی۔ یہی حال دل کا ہے کہ اگر دنیا کی حرص اس پر چھا جائے تو میلا ہو جاتا ہے اور اس میں لیاقت نہیں رہتی۔

حدیث شریف میں ہے:

''اور ہر بچہ پیدا ہوتا ہے فطرت پر لیکن ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' (صحیح بخاری)

درج ذیل فرمان الٰہی مخلوق میں لیاقت کی خبر دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا،

''کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب۔ انہوں نے کہا، جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔'' (الاعراف: ۱۷۲)

عقل مند یا بے وقوف، جس سے بھی پوچھو کہ کیا دو ایک سے زیادہ نہیں ہیں—؟ جواب دے گا ہاں! ضرور زیادہ ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کان سے نہ سنا ہو نہ زبان سے کہا ہو لیکن اس جواب کا سچ ہونا سب کے دل میں ہے۔ اسی طرح سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہر مخلوق کی فطرت میں ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے،

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یہ خود کہیں گے اللہ نے، پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں۔'' (الزخرف: ۸۷)

اور فرمایا ہے:

'' اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا۔'' (الروم: ۳۰)

اے عزیز! اصل انسان جسے ''دل'' کہتے ہیں وقت اور حال کے اعتبار سے اس کی فضیلت تجھے معلوم ہو جائے تو تو جان لے گا کہ اسے فرشتوں اور دیگر تمام

مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ اگر تو دل سے واقف ہوجائے تو ہر شے تیرے تابع ہوجائے گی۔

اللہ نے دل کو قدرت دی ہے کہ اجسام اس کے تابع ہیں۔ اس کے حکم سے دیگر اعضا حرکت کرتے ہیں۔ دل کا تصرف بدن میں جاری ہے۔

دل کی معرفت حاصل کرنے والے کو اللہ اس بات پر قوی کر دیتا ہے کہ وہ جب چاہے، ہمت و توجہ سے بیمار کی طرف توجہ کرے، اور وہ اچھا ہوجائے۔ پس تو معرفت کی تمنا کر۔

اے عزیز! تجھے چاہئے کہ اولیا کی ولایت و کرامت پر اعتقاد رکھے مگر صرف اس کام پر کفایت نہ کر کہ معرفت کا تعلق ریاضت سے ہے۔ نہ یہ جان لینا کافی ہے کہ جو کھیتی بوئے وہ غلہ بھی کاٹے اور جو چلے وہ منزل کو بھی پہنچے اور جو ڈھونڈے وہ پائے۔

یاد رکھ! جو کام ذی شان ہوتا ہے، اس کا راستہ کٹھن اور شرائط زیادہ ہوتی ہیں اور اس کا حصول مشکل ہوتا ہے، مقام معرفت میں ایسے شخص کا درجہ بڑا ہے۔ البتہ مرشد کامل کے بغیر یہ راستہ طے نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی رحمت اور فضل سے بندہ کو منزل پر پہنچاتا ہے۔

دل میں جو صلاحیتیں ہیں، پیغمبران کرام سے ظاہر ہوں تو معجزہ ہے، اولیاء اللہ سے ظاہر ہوں تو کرامت ہے اور کسی بداعتقاد سے ظاہر ہوں تو استدراج ہے۔ یہ سب دل کی خصوصیات ہیں اور ان میں بڑا فرق ہے۔

آشنائے راز

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد* کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شامل ارباب امتیاز کرے

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تری خوشی ہے جو سرفراز کرے

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

(کلام: حسرتؔ موہانی)

* خرد (عقل)

عبدالوحید نظامی

سانس کا آنا جانا ــــ؟

تحقیق کے مطابق ایک صحت مند فرد چھ سے سات لیٹر پانی جذب کرتا ہے اور ایک دن میں اوسطاً 25 سے 30 ہزار تک سانس لیتا ہے۔ اس طرح سانس کی مقداروں میں گیس 390 سے لے کر 400 مکعب فٹ تک ہوتی ہے۔

خالق کائنات اللہ نے ہر شے کو خول یا غلاف میں ظاہر فرمایا ہے جو صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ کہیں پر خول روشنی کا ہے تو کہیں گیسوں کا، کہیں مائع سے بنا ہے تو کہیں مائع ٹھوس ہو جاتا ہے۔ یہ صعود ونزول کے اعتبار سے شے کی مختلف حالتیں ہیں۔

- روشنی ــــ شے کی گیس میں منتقلی سے پہلے کی حالت ہے۔
- گیس ــــ مائع میں منتقل ہونے سے پہلے کا مرحلہ ہے۔
- مائع ــــ ٹھوس سے پہلے کی حالت ہے۔
- ٹھوس ــــ مٹی اور اس سے بنی اشیا ہیں۔

سائنس کے مطابق چیزیں جان دار ہوں یا بے جان، ان کے اندر گیسیں داخل اور خارج ہوتی رہتی ہیں جسے سائنس، سانس لینے کا نام دیتی ہے۔ گیسوں کا عمل دخل مخلوق کی کیمیائی ساخت اور جسمانی افعال کے مطابق ہے۔ مثلاً پتھر اور پہاڑوں میں گیسوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ پرندوں میں سانس کا عمل دخل کئی گیسوں پر مشتمل ہے۔ پرندے زمین کی کشش سے کسی حد تک آزاد ہو کر فضا میں اڑتے ہیں تو فضا میں موجود گیسیں داخل اور خارج ہوتی ہیں۔ اس طرح سانس کا نظام جاری رہتا ہے۔

سانس کے ذریعے گیسوں کے تبادلہ پر غور کیا جائے تو متعدد فارمولوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کی فضا میں ہوا (آکسیجن، نائٹروجن، امونیا، آرگن، نیوآن، ہیلیم، میتھین، کرپٹان، فری آن، ہائیڈروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسیں) دیگر ضروری عناصر سے مل کر مادہ کو ٹھوس اور مائع میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

روشنی پر دباؤ پڑتا ہے تو وہ مختلف گیسوں میں تبدیل ہوتی ہے۔ گیسوں میں دباؤ بڑھنے سے شے مائع (liquid) میں منتقل ہوتی ہے۔ روشنی، گیس اور مائع میں دباؤ سے مراد یہاں ٹھنڈک یا جمود کی طرف سفر ہے۔ مائع کو مزید ٹھنڈا کیا جائے تو وہ ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب اگر ٹھوس شے کو مثبت درجہ میں حرارت دی جائے تو واپسی کا سفر شروع ہوتا ہے جیسے

برف پانی میں، پانی گرم کرنے سے گیسیں اور گیسوں میں حرارت سے روشنی کا چمکنا (spark) رہ جاتا ہے۔

روشنی اور تاریکی یعنی دن اور رات، نظام کائنات کا بنیادی جزو ہیں۔ دن رات اور روشنی تاریکی بھی سانس لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''قسم ہے رات کی جب وہ رخصت ہوتی ہے۔ قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔'' (التکویر: ۱۷۔۱۸)

کائنات کی ہر شے سانس کے اوپر قائم ہے۔ سانس کے ذریعے حواس بنتے ہیں اور حواس کا باطن روشنی ہے۔ حواس کے ظاہری رخ کو ہم فکر یا سوچ سے سمجھتے ہیں۔ سوچ حقیقت سے دور ہو تو قیاس بن جاتی ہے۔

مٹی سے مراد ہر قسم کا مواد (material) ہے۔ مادہ کی ہر حالت یعنی مٹی کی لکیریں سانس لیتی ہیں۔

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

مٹی کی لکیریں ہیں جو لیتی ہیں سانس
جاگیر ہے پاس ان کے فقط ایک قیاس
ٹکڑے جو قیاس کے ہیں، مفروضہ ہیں
ان ٹکڑوں کا نام ہم نے رکھا ہے حواس

مادہ کی اکائی دراصل قیاس کا نتیجہ ہے۔ مثلاً اردو اور انگریزی میں حروف تہجی کی ابتدا الف یا A سے ہوتی ہے۔ دونوں فرض کئے گئے ہیں۔ کسی کے پاس ثبوت نہیں کہ حروف کی ابتدا A یا الف سے کیوں ہوتی ہے اور ہر زبان میں حروف تہجی کی بنیاد کیا ہے۔ اس کے باوجود مادی علوم کی عمارت حروف تہجی پر قائم ہے۔

مادہ میں تغیر ہے لہٰذا فکر یا سوچ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تغیر کی حقیقت مفروضہ کے سوا کچھ نہیں ایسے میں دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور بولنا مفروضہ بن جاتا ہے۔

سانس رکنے سے خیالات کا تسلسل رکتا ہے۔ غیب کی دنیا میں داخل ہونے اور شعور کی سکت کو بڑھانے کے لئے سانس کی مشقوں کی اہمیت ہے جس سے ظاہری حواس درجہ بہ درجہ مغلوب ہوتے ہیں۔

سانس کی چار حالتیں ہیں:

۱۔ سانس اندر داخل ہونا۔
۲۔ داخل ہونے کے بعد ٹھہراؤ یا وقفہ پیدا ہونا۔
۳۔ سانس کا خارج ہونا۔
۴۔ خارج ہونے کے بعد وقفہ پیدا ہونا۔

ان مراحل میں جو شے مشترک ہے وہ ٹھہراؤ یا وقفہ ہے۔ درمیانی مرحلہ کے علاوہ سانس اندر لینا اور خارج کرنا دونوں وقفے ہیں۔ اگر کسی طرح ٹھہراؤ یا وقفہ میں اضافہ کرلیں تو غیب کی دنیا میں داخل ہونے کی سکت بڑھتی ہے۔

موت کے بعد ظاہری جسم کے لئے جب سانس کا عمل دخل رکتا ہے تو فرد دوسری دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ یہ کیفیت موت سے پہلے طاری کرلی جائے تو موت کے بعد کی زندگی سے واقف ہونا ممکن ہے۔ حضور نبی کریمؐ کے ارشاد گرامی ''مرنے سے پہلے

مرجاؤ'' میں اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔

آدمی ایک منٹ میں 15 سے 18 مرتبہ سانس لیتا ہے۔ اگر وہ ایک منٹ میں ایک سانس لے تو پندرہ سے اٹھارہ سانس ذخیرہ (store) ہوتے ہیں اور مقداروں کا دورانیہ مادی حساب سے پندرہ گنا بڑھ جاتا ہے۔ سانس کا دورانیہ دو منٹ ہونے سے زندگی کی مقداروں کا دورانیہ تیس گنا بڑھتا ہے۔ زندگی میں اضافہ نہیں ہوتا، زندگی گزارنے کی اسپیس پھیل جاتی ہے۔ اس جملہ پر غور کیجئے۔

یوگی کئی دن تک سانس روک کر عمر کے دورانیہ کو طول دیتے ہیں لیکن چوں کہ زندگی مقداروں پر قائم ہے اس لئے موت برحق ہے۔

محققین کے مطابق شے میں ٹھوس پن زیادہ ہو تو گیسوں کا عمل دخل سست ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف ٹھوس پن کم ہو تو گیسوں کی حرکت تیز ہوجاتی ہے۔

ایک مثال برف کا پانی بننا ہے۔

سول انجینئرنگ کے اصول کے تحت سخت پتھروں کی وزن برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے پتھروں میں نرمی آتی ہے، وزن برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے۔ نرمی سے مراد گیسوں کی حرکت کا تیز ہونا ہے۔ یعنی گیسیں مائع میں تبدیل ہوکر پتھروں کے ٹھوس پن کو کم کرتی ہیں۔

مثلاً پہاڑی پتھروں سے مرکب زمین (soil) میں وزن برداشت کرنے کی صلاحیت 600 کلو پاسکل * (kPa) ہے۔ ریتیلے پتھروں کی 500، میدانی پتھروں کی 450، سخت زمین کی 400، نرم زمین کی 200 اور دلدلی زمین کی 20 کلو پاسکل ہے۔

میڈیکل سائنس میں گیسوں کے آنے جانے کے عمل کو سانس کی مقداروں سے منسوب کیا گیا ہے۔ اگر اس قانون کو دیگر اجسام پر لاگو کیا جائے تو ہم مادی طور پر ان کے سانس کا دورانیہ معلوم کرسکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پتھروں میں سختی کے سبب گیسیں داخل ہونے کا عمل سست ہے اس وجہ سے ان کے سانس لینے کی رفتار کم ہوتی ہے۔ کسی چیز کے وزن کو برداشت کرنے کا یہی سائنسی اصول وضع کیا گیا ہے۔ یعنی جتنا زیادہ اجسام یا اشیا کے اندر گیسوں کا تبادلہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے وزن برداشت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

درختوں میں مٹی اور بیج مل کر ریشے (فائبر) کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ان ریشوں میں جتنی سختی ہوتی ہے، گیسوں کے داخل اور خارج ہونے کی رفتار کم ہوتی ہے۔ لکڑی میں سختی اور لچک دونوں ریشوں کی مرہون منت ہے۔ جڑی بوٹیوں میں درختوں کے برعکس سختی نہ ہونے کے برابر ہے۔ وجہ ریشوں کا لچک دار ہونا ہے۔

---

* پاسکل اور کلو پاسکل دباؤ کی اکائیاں ہیں۔

لہٰذا جڑی بوٹیاں تیزی سے سانس لیتی ہیں۔

جن جان داروں میں سیال مائع کی گردش تیز ہو، اثر سانس لینے کے دورانیہ پر پڑتا ہے۔ ان میں حشرات الارض، حیوانات اور پرندے وغیرہ شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی حیوان ناطق ہے۔ ایک منٹ میں 15 سے 18 سانس لیتا ہے۔ تحقیق کے مطابق ایک صحت مند فرد چھ سے سات لیٹر پانی جذب کرتا ہے اور ایک دن میں اوسطاً 25 سے 30 ہزار تک سانس لیتا ہے۔ اس طرح سانس کی مقداروں میں گیس 390 سے لے کر 400 مکعب فٹ تک ہوتی ہے۔

سانس کیا ہے —؟ اس بارے میں خانوادہ سلسلہ عظیمیہ محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

’’سانسوں کا تعلق کیلوریز سے ہے۔ آنا اور جانا، دو مقداریں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو ہم اسے سانس کہتے ہیں۔ سانس لینے اور سانس باہر آنے میں جو شے متاثر ہوتی ہے وہ سانس کا ٹھہراؤ یا عدم ٹھہراؤ ہے یعنی سانس اگر گہرا ہوگا، چوں کہ سانس کا وقفہ بڑھ جائے گا اس لئے عمر زیادہ ہوگی۔ آسمانی کتابوں کے مطابق آدمی خلا ہے۔ جتنا زیادہ خلا ہوگا، اسی مناسبت سے شے ٹھوس اور وزنی ہوگی۔ ٹھوس ہونے کے باجود وزنی شے میں خلا زیادہ ہے۔ اگر پہاڑ کو روحانی نقطۂ نظر سے سمجھا جائے تو پہاڑ دراصل خلا ہے۔ پہاڑ میں بہت گہرے گہرے crevice (دراڑ، درّہ) ہیں۔ پہاڑ ٹھوس سمجھے جاتے ہیں لیکن قرآن کریم کے مطابق ’وتری الجبال جامدۃ‘ تم دیکھ رہے ہو کہ پہاڑ جمے ہوئے ہیں، ’وھی تمر مر السحاب‘ وہ جمے ہوئے نہیں، بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ بادل کیا ہیں —؟ بادل خلا ہیں، سمجھنے کے لئے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ بادل اللہ تعالیٰ کے مشکیزے ہیں۔ مشک جتنی زیادہ کھلے گی، اسی مناسبت سے پانی کا اخراج زیادہ ہوگا جس کو ہم اردو میں طوفانی بارش کہتے ہیں۔‘‘

بادل کیا ہیں —؟ الہامی کتابیں بتاتی ہیں،

’’تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو اور سمجھتے ہو کہ جمے ہوئے ہیں، یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔‘‘ (النمل:۸۸)

’’کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی بادل کو چلاتا ہے،

پھر اسے ملاتا ہے، پھر اسے تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے بیچ میں سے نکلتی ہے اور آسمان سے جو اس میں اولوں کے پہاڑ ہیں ان میں سے اولے برساتا ہے پھر انہیں جس پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جن سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کو لے جائے۔''

(النور: ۴۳)

کتاب ''زبور'' میں لکھا ہے،

''اے خداوند آسمانوں کو جھکا کر اتر آ۔
پہاڑوں کو چھو تو ان سے دھواں اٹھے گا۔
بجلی گرا کر ان کو پراگندہ کر دے۔''

(زبور: باب:۱۴۴، آیت: ۵۔۶)

وید میں لکھا ہے،

''یہ کرۂ زمین اور سورج و چاند وغیرہ دیگر کرات انترکش (خلا) کے اندر حرکت یا گردش کرتے ہیں۔ سمندر کا پانی زمین کا مخرج بمنزلہ مادر زمین ہے کیوں کہ زمین سمندر سے اُڑے ہوئے بخارات کے بادلوں سے اس طرح ڈھکی رہتی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے۔'' (یجروید ۶:۹)

روحانی ماہرین کے مطابق پہاڑ کا ایک سانس 15 منٹ میں پورا ہوتا ہے۔ اگر فرد پندرہ منٹ میں ایک سانس لے تو پہاڑ پر تصرف ممکن ہے۔

دیگر مخلوقات میں گائے ایک منٹ میں 10 سے 30، کبوتر اوسطاً 24 اور گھوڑا 12 سانس لیتا ہے۔

اسی طرح کرۂ ارض 12 گھنٹے میں سانس لیتی اور 12 گھنٹے میں خارج کرتی ہے۔ خلا میں قیام پذیر اجسام زمین، سورج، چاند، ستاروں وغیرہ میں سانس کی مقدار اجسام کی ساخت، ماہیت اور ان کی فضا میں موجود گیسوں کے مطابق ہوتی ہے۔ ماورائی اجسام مثلاً جنات اور فرشتوں میں سانس کا دورانیہ لطافت اور فضائی ماحول کے مطابق ہے۔

کائنات میں ہر شے کی بنیاد روشنی ہے، روشنی گیسوں میں، گیس مائع میں اور مائع ٹھوس میں تبدیل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے روشنی کو ''ماء'' یعنی پانی کہا ہے۔ محقق پانی کو گیسوں کا نام دیتے ہیں۔ ماء کے نزول سے کائنات کے مادی رخ کا مظاہرہ شروع ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''اللہ نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی (ماء) برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسانی کے لئے ثمرات پیدا کئے۔'' (ابراھیم: ۳۲)

تحقیق کے مطابق کرۂ ارض کے گرد مختلف اقسام کی گیسوں کا ہجوم ہے جن میں بیش تر دریافت نہیں ہوسکیں۔ زمین سے لے کر چاند تک اور چاند سے دیگر ستاروں کے درمیان خلا ہزاروں اقسام کی گیسوں پر مشتمل ہے۔ ان سے کہکشانی نظام وجود میں آتے ہیں اور ان نظاموں میں زندگی کی بنیاد گیسیں ہیں۔

ربا عی میں فارمولے پر غور کرنے سے کائنات کی ساخت واضح ہوتی ہے۔

مٹی کی لکیریں ہیں جو لیتی ہیں سانس
جاگیر ہے پاس ان کے فقط ایک قیاس
ٹکڑے جو قیاس کے ہیں مفروضہ ہیں
ان ٹکڑوں کا نام ہم نے رکھا ہے حواس

ابدالِ حق نے کائنات کی ظاہری ساخت کو مٹی سے تعبیر کیا ہے۔ سورج، چاند ستارے، زمین اور زمین پر موجود مخلوقات نباتات، جمادات، حیوانات سب مٹی ہیں۔ مٹی میں سانس یعنی گیسوں کی آمدورفت جاری ہے، نتیجہ میں مادہ ظاہر ہو کر علم بن رہا ہے۔

سانس کا وقفہ شے کے ٹھوس، مائع یا گیس ہونے کے سبب مختلف ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ شے ٹھوس ہو، مائع ہو یا گیس ـــ ہے وہ ایک شے کی مختلف حالتیں۔ ان کے سمٹنے اور پھیلنے سے سانس کی رفتار کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ رفتار کم ہو تو مادی حواس مغلوب ہوتے ہیں اور سانس کی رفتار زیادہ ہونے سے غالب ہو جاتے ہیں۔

حواس کیا ہیں ـــ؟ حواس خیال کی تقسیم ہیں جب کہ خیال تقسیم نہیں ہوتا۔ سمجھنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ کان سنتے ہیں، آنکھ دیکھتی ہے، ناک سونگھتی ہے، جسم محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس خواب کی دنیا میں بھی سننے دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل ہے لیکن جس کو ہم آنکھ سمجھتے ہیں وہ بند ہوتی ہے۔ جس کو ہم سننا سمجھتے ہیں یعنی کان کی کارکردگی معطل ہوتی ہے۔ آنکھ ناک کان سب مفروضہ ہے ـــ دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، بولنا اور سانس لینا اعضا کا پابند نہیں۔

> آدمی ایک منٹ میں 15 سے 18 مرتبہ سانس لیتا ہے۔ اگر وہ ایک منٹ میں ایک سانس لے تو پندرہ سے اٹھارہ سانس ذخیرہ (store) ہوتے ہیں اور مقداروں کا دورانیہ مادی حساب سے پندرہ گنا بڑھ جاتا ہے۔ سانس کا دورانیہ دو منٹ ہونے سے زندگی کی مقداروں کا دورانیہ تیس گنا بڑھتا ہے۔

جب ہم نے علوم کی بنیاد مفروضہ پر رکھی ہے تو پھر ہم دیکھنے اور سننے سے کیسے واقف ہوئے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ سانس کیا ہے۔ آیا جس کو ہم سانس سمجھ رہے ہیں، کیا سانس وہی ہے ـــ؟

یہ ٹھیک ہے کہ سائنس نے سانس کو جسم میں گیسوں کا آنا جانا کہا ہے لیکن سوال یہ بھی ہے کہ گیسیں بھی مخلوق ہیں اور وہ بھی سانس لیتی ہیں۔ پھر سانس کیا ہے ـــ؟ گیسیں جسم میں داخل اور خارج ہوتی ہیں، ان کو خارج اور داخل کرنے والی ہستی کون ہے ـــ؟

جب تک آدمی اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتا، اس کی زندگی قیاس ہے اور قیاس ان حواس پر قائم ہے کہ جو حس کان میں داخل ہو رہی ہے وہ الگ ہے، آنکھ میں داخل ہونے والی الگ، ناک اور منہ میں داخل ہونے والی الگ ہے۔ حس ایک ہے۔ اس کی تقسیم قیاس ہے اور ان ٹکڑوں کا نام ہم نے حواس رکھا ہے!

حواس دو ہیں، ایک reality اور ایک illusion۔ ان کی مثال خواب اور بیداری کی زندگی ہے۔

محمد الدین فوق

شہنشاہ ظرافت ـــــ ملا دوپیازہ

شہنشاہ لطافت وظرافت، والی ملک زندہ دلی وخوش طبعی، بذلہ سنجی و حاضر جوابی، سریر آرائے سلطنت شوخی و دل لگی ـــ ابوالحسن ملا دوپیازہ کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ قارئین کی خوش طبعی کے لئے ابوالحسن دوپیازہ کی سوانح عمری پیش خدمت ہے جو مولف ''محمد الدین فوق'' نے 1911ء میں ترتیب دے کر شائع کی۔

ابوالحسن دوپیازہ دربار میں پہنچ کر چند دنوں کے بعد خداداد لیاقت وظرافت کے باعث یہاں تک بے تکلف اور بے دھڑک ہو گئے تھے کہ اکبر کے نورتنوں کے علاوہ خود بادشاہ سلامت سے مذاق کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اکبر خوش طبع بادشاہ تھا اس لئے شیشۂ دل پر ملال نہیں لاتا تھا۔ شیخ سعدی کے اس مقولہ کی طرح کہ بادشاہ کبھی تعریفوں سے ناراض ہوتے ہیں اور کبھی طنزیہ باتوں سے خوش۔ وہ ابوالحسن کو انعام واکرام سے نوازتا تھا۔

اکبر کے دربار میں ایک رتن بیربل بھی تھا۔ ملا دوپیازہ اور بیربل کے لطیفے اکثر غیر مہذب ہوا کرتے تھے مگر برمحل اور باموقع ہوتے تھے۔ البتہ غیر شائستہ ہونے کی وجہ سے ان کی نسبت افسوس ہے کہ اگر وہ احاطۂ تحریر میں لائے جائیں تو تہذیب وشائستگی کا خون ہو جاتا ہے اور اخلاق ومتانت دامن پکڑ لیتے ہیں۔ خوش طبع لوگوں نے اور ستم یہ کیا کہ جو سب سے زیادہ فحش لطیفہ دیکھا یا سنا اسے ملا دوپیازہ اور بیربل سے منسوب کر دیا۔

ملا دوپیازہ کا ایک شعر تو شاگرد کی غزل میں جا چکا ہے، جو آپ نے پچھلی سطروں میں پڑھا۔ باقی جو معلوم ہو سکے ہیں، اس طرح ہیں۔ دوپیازہ صاحب، خواجہ حافظ کے مصرع پر مصرع لگاتے ہیں،

بہ پہلویم رسید امروز دلدارم بہ ناچاقی
ادرکاساً و ناولہا الا یا ایّہا السّاقی

ترجمہ: بڑی مشکل سے آج محبوب میرے پہلو میں آیا ہے۔ ساقی شراب کا دور چلا اور مجھے جام دے۔

ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے یہ مصرع دیا،

بیا اے محتسب ساغر بکش دین الٰہی شد

ترجمہ: اے محتسب آؤ اور شراب پیو کہ دین الٰہی نافذ ہو چکا ہے۔

ملا صاحب نے جواباً فرمایا،

نکاحِ دخترِ رز جائز کنوں از مہرِ شاہی شد

ترجمہ: انگور کی بیٹی (شراب) کا نکاح اب بادشاہ کی مہر (فرمان) سے جائز ہوگیا ہے۔

ایک شعر اور ملاحظہ ہو:

می نوشتم نامہ و بر نامہ بر بردم حسد

ایں چرا پیش از من مہجور بیند روئے دوست

ترجمہ: میں نے خط لکھا اور پھر مجھے قاصد سے حسد محسوس ہوا۔ وہ کیوں مجھ جیسے جدائی کے مارے سے پہلے محبوب کا چہرہ دیکھ لے۔

ایک روز دو پیازہ جوتی سمیت دربار میں چلے آئے۔ اہل دربار نے افسوس کیا اور گستاخی پر بادشاہ کو متوجہ کیا۔ بادشاہ نے دو پیازہ کی یہ حرکت لایعنی دیکھی تو پوچھا،

ملا چہ کار کردۂ ؟ (ملا، کیا کرتے ہو؟)

ملا گفت، ہیچ نہ کردہ، بر قول عمل کردہ۔

(ملا نے کہا، کچھ نہیں کیا۔ قول پر عمل کیا،)

پادشاہ گفت، او چگونہ است،

(بادشاہ نے پوچھا، وہ کیا ہے؟)

گفت (اپنی جوتی کی طرف اشارہ کر کے) اینست کہ نعلین تحت العین۔

(یہی کہ جوتیاں اپنی نگاہ کے نیچے رکھو۔)

ابوالحسن ملا دو پیازہ نے ہندوستان آنے کے بعد ایک بار پھر ایران کا سفر کیا اور دوران سفر شاہ ایران سمیت وہاں کے دانش وروں سے ملے۔

کہتے ہیں کہ ایران میں قیام کے دوران جب انہوں نے اپنے دلائل سے وہاں کے دانش وروں کو تنگ کرنا شروع کیا تو وہ ان کی بے دخلی یا ہلاکت کی تدبیریں سوچنے لگے۔ آخر انہوں نے صلاح کی کہ قصہ پاک کر دینا چاہئے۔ چناں چہ یہ تجویز قرار پائی کہ ملا سے سر دربار دریافت کیا جائے کہ آیا تیرا بادشاہ اچھا ہے کہ ہمارا۔ اگر اس نے ہمارے بادشاہ کی تعریف کی تو اکبر اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ اور جو اکبر کی تعریف میں زبان کھولی تو—؟ دربار عام میں بلوایا گیا اور خیر خواہان دربار نے دریافت کیا کہ جناب آپ کے بادشاہ سلامت اچھے ہیں یا ہمارے—؟ شہنشاہ ظرافت نے خاموشی اختیار کی۔ اور مکرر جو دریافت کیا گیا تو بھی جواب نہ دیا۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ مہمان دانش ور خاموش ہے تو خاص اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ یہ خاموشی کیسی—؟ جواب دیجئے!

دو پیازہ گویا ہوئے، حضور کے قربان جاؤں، آپ ماشاءاللہ بدر ہیں تو ہمارے بادشاہ ہلال۔

یہ سن کر شاہ ایران بہت خوش ہوا اور انعام دیا۔

اسی وقت خبر اکبر کو روانہ کر دی گئی۔ اکبر نہایت برافروختہ ہوا اور طلبی کا حکم روانہ کیا۔

دو پیازہ کا ایران میں کچھ عرصہ مزید قیام کا ارادہ تھا لیکن پروانہ ملتے ہی ناچار واپس آنا پڑا۔

اکبر کے دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے فرمایا، کیوں صاحب، یہ غیروں کے سامنے ہماری برائیاں، گویا جس برتن میں کھانا اسی میں سوراخ کرنا۔ تمہاری سزا ہے کہ کل ہلاک کئے جاؤ گے۔ دست بستہ عرض کیا، حضور خاکسار کو قصور سے مطلع فرمائیں۔ بادشاہ نے وہ خبر جو ایران سے آئی تھی، سنائی۔ دوپیازہ نے زمین چومی اور عرض کیا، کیا آپ نے اس کا مطلب سوچا ہے۔

بادشاہ نے خشم آلودہ ہوکر کہا، اچھا آپ ہی بتلائیے۔

گزارش کی کہ خاکسار نے جو حضور کو ہلال بتایا یعنی اول شب کا چاند سو درست ہے کیوں کہ آپ کو ہر روز عروج ہے۔ اور ان کو بدر یعنی چودھویں رات کا چاند کہا، تو ان کو دن بدن تنزل ہے۔ کہاں ذرّہ کہاں خورشید عالم! اکبر کو بات پسند آئی اور بہ نسبت شاہ ایران کے بہت کچھ انعام واکرام سے نوازا اور حکم دیا کہ اب یہاں سے کہیں تشریف نہ لے جائیں۔ خبر ایران پہنچ چکی تھی لہٰذا اس کے بعد وہاں جانے کی غلطی نہیں کی۔

اکبر کے نو رتنوں میں سے ایک مرزا عزیز کوکلتاش تھے۔ انہوں نے نیا مکان تعمیر کرایا اور احباب کی دعوت کی۔ بیربل اور دوپیازہ بھی مدعو تھے۔ اہل دعوت نے مکان کی تعریف کی۔

بیربل کہنے لگا، مکان واقعی اچھا ہے مگر دروازہ اس قدر تنگ ہے کہ مردہ کی چارپائی مشکل سے نکل سکے گی۔

مرزا عزیز کوکلتاش کو راجا بیربل کی بات سخت ناگوار گزری۔ دوپیازہ صاحب سے شکایت کی۔

انہوں نے کہا، راجا جی کو کیا عقل ہے، مکان کا دروازہ تو اتنا بڑا ہے کہ اگر آپ کا سارے کا سارا کنبہ مرجائے تو تمام مردے بافراغت نکل سکتے ہیں۔

مرزا عزیز نے شاکی لہجہ میں کہا، یہ کیا! آپ تو راجا جی سے بھی بڑھ گئے۔ عرض کیا، آپ کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ایک روز بادشاہ اکبر نے درباریوں کو حکم دیا کہ اہالیان دربار کے خصائل بیان کرو۔ سب نے اپنی باری پر کچھ نہ کچھ کہا۔ دوپیازہ نے اپنی باری پر عرض کیا کہ حضور لطف تو جب ہے کہ میں بیان کروں اور یہ لوگ تصدیق کریں۔

اکبر بولا، ضرور تصدیق کریں گے ورنہ ہم تحقیقات کا حکم دیں گے۔ درباری جز بز ہونے لگے کہ دوپیازہ کے تیور خطرناک ہیں، نجانے کیا کہہ دے۔

جناب دوپیازہ بولے، اب توجہ بندگان عالی کمترین کی طرف مبذول ہو۔ دوزانو بیٹھ کر مؤدبانہ عرض کیا،

۱۔ جس شخص کا سر لمبا، بال باریک، چہرہ گول، بدن فربہ، سینہ کشادہ اور بازو دراز ہوں وہ سریع الاعتقاد اور عقل سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ بادشاہ مسکرا دیا کہ اس نے مجھ کو بھی نہ چھوڑا اور ابتدا مجھ سے کی۔

۲۔ اور جو شخص چلنے میں اکڑ اکڑ کر اور کولہے ہلا کر چلے وہ کم عقل اور بے ہودہ گو ہوتا ہے۔ میاں فیضی تائید کرو!

۳۔جس کے بال بھورے ہوں، وہ حیلہ باز، چغل خور، حاسد اور دو رویہ ہوتا ہے۔ کیا ابوالفضل صاحب ٹھیک ہے ــــ؟

۴۔اور جو کوئی بات کرنے میں نگاہ سے نگاہ نہ ملائے، اور دزدیدہ نگاہ (کن اکھیوں) سے دیکھے، وہ صاف دل کا نہیں ہوتا۔ بیربل صاحب غور فرمائیں۔

۵۔جس شخص کے سر اور داڑھی کے بال گھنے اور بھنویں ملی ہوئی ہوں، ناک اونچی ہو، مگر آگے سے جھکی ہوئی ہو، بڑا شہوت پرست ہوتا ہے۔ کیوں جناب عبدالقادر صاحب ــــ؟

۶۔جس کے سینہ پر بال ہوں، چھریرا بدن اور سوکھی ٹانگیں ہوں، وہ خبطی اور بکواسی ہوتا ہے۔ حکیم ہمام!

۷۔جس کی ناک بڑی اور قد پستہ ہو، وہ زن مرید ہوتا ہے۔ کیوں خان خاناں سچ ہے ــــ؟

۸۔جس کی پیشانی تنگ اور گردن موٹی ہو، وہ سخت بخیل ہوتا ہے۔ مرزا عزیز کوکلتاش ــــ؟

سب کے تیور بگڑ گئے تھے لیکن اکبر نے خوب لطف اٹھایا اور آخر میں داد سے نوازا۔

ملا دوپیازہ دربار شاہی میں بڑے تکلف سے پگڑی باندھ کر جاتے تھے۔ مگر راجا بیربل کے سر پر ٹوپی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن دوپیازہ اپنی پگڑی کی بے حد تعریف کر رہے تھے جسے سن کر راجا صاحب خاموش نہ رہ سکے اور بادشاہ سے کہنے لگے، جہاں پناہ یہ یوں ہی اپنی پگڑی کی گپیں ہانک رہے ہیں، کل میں بھی پگڑی باندھ کر آؤں گا جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ ان کے دعوے فضول ہیں۔

دوسرے دن بیربل شیشہ سامنے رکھ کر ایسی عمدہ پگڑی باندھ کر دربار میں حاضر ہوا کہ بادشاہ نے کہا، واقعی بیربل نے اچھی پگڑی باندھی ہے۔

دوپیازہ نے جواب دیا کہ جہاں پناہ اس نے تو اپنی جورو سے بندھوائی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا، اس کا کیا ثبوت ــــ؟ ملا جی نے جھٹ اپنی پگڑی اتار کر کہا، یہ بھی اتار دیں اور پھر دونوں بادشاہ کے سامنے باندھیں اس سے معلوم ہو جائے گا کہ میں تو خود پگڑی باندھتا ہوں اور یہ اپنی جورو سے بندھوا کر لایا ہے۔

بادشاہ نے کہا بہت خوب۔ راجا بیربل پگڑی اتاریں اور آپ دونوں ہمارے سامنے باندھیں۔ اب میدان تو ملا جی کے ہاتھ تھا ہی، جیسی پگڑی باندھتے تھے، ویسی باندھ لی مگر راجا بیربل شیشہ دیکھ کر پگڑی باندھنے والے تھے۔ بغیر آئینہ پگڑی بندھ نہ سکی۔ بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بیربل کو شرمندہ ہونا پڑا۔

ایک دفعہ بیربل نے فیل بان کی شکایت کی اور کہا کہ جس کے نام کے آگے بان آتا ہے وہ بڑے شریر ہوتے ہیں۔ مثلاً فیل بان، شتر بان۔ دوپیازہ سے رہا نہ گیا، شوخی طبع و حاضر جوابی کے نشتر دل میں چٹکیاں لینے لگے، بے اختیار ہو کر فرمایا، سچ کہتے ہو مہربان! (قسط: ۳)

عابد محمود

ادھورا ــــ؟

چنبیلی کا تعلق اس طبقہ سے ہے جسے معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ بچپن سے تکلیف دہ رویوں کو سہتے ہوئے وہ اس وقت ٹوٹ گیا جب حالات کی تلخی سے مجبور ہو کر ماں نے اسے گرو کے پاس بھیج دیا۔ چنبیلی کا کردار فکری طور پر مفلوج رویوں کے لئے آئینہ ہے۔ اللہ نے جس کو جس طرح پیدا کیا ہے، وہ اللہ کی تخلیق ہے۔ اللہ کی تخلیق کا مذاق اڑانا ایسا عمل ہے جس پر غور کیا جائے تو وجود دہل جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ کبھی کسی کی دل آزاری کا سبب نہ بنیں کہ ہر دل میں اللہ بستا ہے۔

چنبیلی انجان لوگوں کے سامنے رقص کرنے میں ہمیشہ عجیب محسوس کرتا تھا۔ لوگوں کے جملے کسنے اور چٹکیاں لینے سے عزت نفس مجروح ہوتی۔ اس طرح کی محفلوں کے بعد گھٹنوں گھٹنوں میں سر دیئے خود سے سوال جواب کرتا رہتا۔

شانو جس محفل میں اس کو لے کر آیا وہ اسے پسند نہیں آئی۔ یہ کوئی شادی بیاہ یا بچہ کی پیدائش کی محفل نہیں تھی۔ مشروب کی بوتلیں ہوئی تھی۔ وہاں موجود لڑکوں نے جس نظر سے چنبیلی کو دیکھا، اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ رقص شروع ہوا۔ لڑکوں نے بدھائیوں کی شکل میں پیسے لٹانے شروع کر دیئے۔ شانو کا لڑکوں سے میل جول چنبیلی کو سخت ناگوار گزرا۔ آہستہ آہستہ چنبیلی کے ساتھ لڑکوں کی دست درازیاں بڑھنے لگیں۔ اس نے غصہ سے رقص چھوڑا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ اسے ایک کمرے میں محصور کر دیا گیا۔ گھبرا کر دروازہ پیٹا۔ چنبیلی کھسرا بند کمرے میں روتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلا اور چار لڑکے داخل ہوئے۔

آنکھ کھلی تو وہ ویرانہ میں پڑا تھا۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ وہ دنیا کو برباد کر دینا چاہتا تھا، اس کے اندر نفرت کے انگارے دہک رہے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے جانے کب تک چلتا رہا۔

دور ایک آستانہ دیکھا۔ سنا تھا کہ اللہ کے دوست تمام اغراض سے پاک ہوتے ہیں۔ اسے لگا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں امان مل سکتی ہے۔ وہ اب کھسروں کی دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ آستانہ تک پہنچتے پہنچتے ہمت جواب دے گئی اور وہ گر گیا۔

شاہ بابا کے خاص شاگرد مرید شاہ کا خدمت گزار کمرے میں داخل ہوا اور کہا، بابا سائیں! ڈیرے کے باہر ایک کھسرا زخمی حالت میں پڑا ہے۔

خادم نے مرید شاہ کو اطلاع دی۔

مرید شاہ بولا، لاحول والاقوۃ۔ کھسرا ہمارے ڈیرے پر کہاں سے آ گیا۔ مرہم پٹی کر کے رخصت کرو۔ خواہ مخواہ لوگ سوچیں گے کہ اب ڈیرے پر کھسرے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ مرید شاہ نے ناگواری سے کہا۔

لیکن وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ فریاد لے کر گرتا پڑتا یہاں تک پہنچا ہے۔ خادم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

کیا میں اب کھسروں سے ملوں گا! مرید شاہ نے خادم کو جھڑک دیا۔ کہا نا کہ مرہم پٹی کر کے لنگر کھلاؤ اور رخصت کر دو۔ خادم نے جی جناب کہہ کر الٹے پاؤں باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

رات کو مرید شاہ مراقب ہوا تو اپنے مرشد شاہ بابا کو سخت جلال کی حالت میں دیکھا۔ وہاں ایک کھسرا زخمی حالت میں لیٹا ہوا تھا جس کی وہ مرہم پٹی کر رہے تھے۔

مرید شاہ کو جلال سے دیکھتے ہوئے کہا،

تمہاری ڈیوٹی ختم!

مرید شاہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد رابطہ کی بہت کوشش کی لیکن تعلق منقطع ہو گیا۔ بے چینی بڑھی اور گڑگڑا کر معافی مانگی مگر خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ فوراً خادم کو بلایا اور ضروری ہدایات کے بعد رات کو ننگے پاؤں شاہ بابا کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن شاہ بابا کے آستانہ پر پہنچا تو ان لوگوں نے جو مرید شاہ کے آنے پر اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، شاہ بابا سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک مہینہ آستانہ پر معافی کا طلب گار رہا لیکن انہوں نے ملاقات نہیں کی۔

مرید شاہ کا سب کچھ ختم ہو گیا۔ عہد کر لیا، مر جائے گا لیکن معافی کے بغیر نہیں جائے گا۔

ایک روز شاہ بابا کا پیغام ملا کہ اگر اس شخص سے معافی مانگ لو جو مدد کے لئے تمہارے پاس آیا تھا تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ مزید یہاں رکنا مناسب نہیں، جا سکتے ہو۔

مرید شاہ تین سال سے کھسروں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اس کھسرے کی تلاش میں تھا جو آستانہ پر آیا تھا۔ تلاش کرتے ہوئے بالآخر چھمیا تک پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ یہاں رہا۔ جب چنبیلی کو دیکھا تو رنگ روپ اور قد کاٹھ وہی تھا جو خادم نے بتایا تھا۔ اس نے چھمیا کھسرے کو بہلا پھسلا کر راضی کر لیا کہ وہ چنبیلی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔

چھمیا نے چنبیلی سے بات کی تو پہلے تو وہ کسی کو رکھنے پر راضی نہیں ہوا لیکن جب مرید شاہ کو دیکھا تو نہ جانے کیوں وہ اسے معصوم اور بھولا سا لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لی۔

مرید شاہ کم گو تھا لیکن اس کی باتیں معنی خیز ہوتی

تھیں۔لگتا تھا کہ کوئی بڑا آدمی ہے۔لیکن اگر بڑا آدمی ہے تو کھسروں میں کیا کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بعض لوگوں کو شوقیہ ہیجڑا بننے کا شوق ہوتا ہے۔

تم ہیجڑے ہو کیا؟ چنبیلی نے نخرے سے ادائیں دکھاتے ہوئے مرید شاہ سے پوچھا۔

مرید شاہ نے کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا، میں خود کو ساری زندگی مرد سمجھتا رہا لیکن اب لگتا ہے کہ میں مرد نہیں ہوں۔

اوہ تو مخنث ہو۔نامرد کو تو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ ہمارے ساتھ کیوں رہتے ہو۔ہم جیسے ادھوروں کے پاس کیسے آ گئے ــــ؟

میں نے تو تم لوگوں میں آ کر جانا کہ اللہ نے تمہیں مضبوط پیدا کیا ہے۔لوگوں کی تیز و تند، تمسخرانہ اور تذلیل بھری باتیں مسکرا کر سہہ لیتے ہو۔جانتا ہوں کہ یہ سب کس قدر تکلیف دہ ہے لیکن تم سارا درد مسکراہٹ میں چھپا لیتے ہو، بہت مشکل ہنر ہے یہ۔تم لوگوں کے اندر ''میں'' نہیں ہے جو مجھ میں مدتیں گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہو سکی۔ ادھورا تو میں ہوں۔ میرے گرو نے تمہارے پاس مجھے مکمل ہونے کے لئے بھیجا ہے۔ چاہو تو میرے ادھورے پن کو ختم کر سکتی ہو۔مرید شاہ نے گھگھیائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

چنبیلی اکتاہٹ سے بولا، اے ہے میں تو خود ادھوری ہوں میں کسی کو کیا مکمل کروں گی۔معلوم نہیں کس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ کچھ ڈھولکی وولکی، کوئی رقص بھی سیکھا ہے کہ بس ایسے ہی مخنث کے مخنث ہو۔

کچھ کچھ سیکھ گیا ہوں باقی جو تم سکھا دو۔مرید شاہ نے چنبیلی کو برہم ہوتے دیکھ کر عاجزی سے کہا۔

رات کو رقص کا ریاض شروع ہوا تو اس نے مرید شاہ کو بلایا۔ڈھولکی کی تھاپ پر چنبیلی نے اسے اپنے ساتھ رقص کرنے کو کہا۔مرید شاہ نے رقص شروع کیا تو آہستہ آہستہ ماحول سے بے نیاز ہونے لگا۔

چنبیلی کو لگا کہ مرید شاہ کے رقص میں دیوانگی ہے، یہ جس کا دیوانہ ہے اس کے لئے رقص کرتا ہے اسی لئے تو ماحول سے بے نیاز ہو گیا، رقص تو مجھے اس سے سیکھنا چاہئے، بند آنکھوں سے وہ تخیل میں کسی کو سامنے بیٹھا دیکھ کر رقص کر رہا تھا لیکن کس کو ــــ؟

چنبیلی! آج تمہارے رقص میں وہ بات نہیں، بدھائیاں نہیں لینی ہیں کیا۔لڑکے نے چٹکی لیتے ہوئے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔

چنبیلی نے بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھا تو پیر ڈھولکی کی تھاپ پر تیزی سے تھرکنے لگے۔چار گھنٹے گزر گئے، سانس پھول گیا تھا لیکن لوگوں کا اصرار بڑھ رہا تھا۔مرید شاہ نے بہت کوشش کی کہ محفل ختم ہو لیکن وہ بھی بے بس ہو گیا۔بالآخر جیلا جی کو ڈھولکی پکڑائی اور پاس رکھے تھیلے کو اٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔باہر نکلا تو میک اپ اور زنانہ کپڑوں نے حلیہ بدل دیا تھا۔

چنبیلی اس کو زنانہ روپ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جب مرید شاہ نے رقص شروع کیا تو خاموشی چھا گئی۔ وہ دیوانہ وار رقص کر رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی کیفیت ہوگئی — ہر طرف سے بے نیازی۔

طنزیہ جملے ختم ہو چکے تھے۔ ڈھولکی کی تھاپ اور مرید شاہ کے گھنگروؤں کی آواز تھی۔

چنبیلی کی نظر میں مرید شاہ کی عزت بہت بڑھ گئی۔ وہ رقص کا گرو تھا اور نہیں جانتا تھا کہ مرید شاہ اس سے بڑا رقاص ہوسکتا ہے۔ اس کی عادات و اطوار اور باتیں سب سے الگ تھیں۔ لگتا تھا کہ بہت بڑے گھر کا چشم و چراغ ہے مگر — چنبیلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ادھورے لوگوں میں کیا کر رہا ہے۔ وہ الجھ گیا۔

ایک روز پوچھا، سچ بتاؤ تم کون ہو اور ہم ادھورے لوگوں میں کیا کام؟ تمہیں دیکھ کر تو مجھے دکھ ہوتا ہے، میں تو اپنی تقدیر کے لکھے کو پورا کرنے پر مجبور ہوں، تمہاری کیا مجبوری؟

چنبیلی نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

کوئی بھی ادھورا پیدا نہیں کیا گیا۔ ادھورا تو وہ ہوتا ہے جس کی تکمیل نہ ہو سکے۔ جسم تو محض لباس ہے۔ ادھورا تو میں ہوں جس نے تمہارے ساتھ رہ کر جانا کہ تزکیۂ نفس کیا ہوتا ہے۔ تم اپنی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کے بعد بھی اس قدر مضبوط ہو کہ کسی کے لئے برا نہیں سوچتے۔ میں نے تم سے عجز و انکساری سیکھی ہے۔ اللہ تعالی ایک وصف نہ دے کر ہزاروں ان دیکھے وصف عطا کر دیتا ہے۔ سب مشیت کے بہروپ ہیں۔ کہیں اس کی مشیت مرید شاہ ہے تو کہیں چنبیلی۔

لیکن تم ہو کون — ؟ چنبیلی نے بصد اصرار پوچھا۔

نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ حقیقت کی تلاش مجھے شاہ بابا کے پاس لے گئی۔ سفر شروع ہوا تھا کہ انا اور غرور درمیان میں آ گئے۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں اپنے مرشد کے در پر واپس جا سکتا ہوں۔ تمہارا مجرم ہوں۔

ہائے اللہ مرید شاہ یہ کیا کہہ رہے ہو — ؟ ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ جہاں خون کے رشتے اپنے نہ ہوں، جگہ جگہ سے دھتکارا جانا، ہر کھسرے کا نصیب ہے۔ سنا تھا کہ اللہ کے ولی سب کو سینہ سے لگا لیتے ہیں، مجھے تو اللہ کے دوستوں نے بھی دھتکار دیا اور اس وقت دھتکارا جب مجھے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ میں تو ہمیشہ کے لئے اللہ والوں کی ہونے گئی تھی لیکن اس میں ان کا کیا قصور، ہمارے نصیب کی سیاہی میں دھتکار ہے۔ تقدیر نے مجھ کو ادھورا پیدا کر کے ہر چہرہ میرے سامنے عیاں کر دیا۔ دنیا سے کوئی امید نہیں رہی۔ افسوس تو یہ ہے کہ اللہ نے دنیا سے دور کر کے بھی اپنے قریب نہیں کیا۔

مرید شاہ کے چہرہ پر ندامت اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے جب کہ چنبیلی کی نمکین آنکھوں میں حسرت اور شکایت تھی۔

لگتا ہے کہ میں جسمانی اور روحانی دونوں طرح سے ادھوری ہوں۔ تم میرے کس بات کے مجرم ہو۔ چنبیلی

کھسرا کسی سے کیا انتقام لے گی، مجھے تو ڈانٹنا بھی نہیں آتا لیکن ہاں! معاف کرنا آتا ہے۔ میرے حق میں تم سے جو بھول چوک ہوئی، معاف کیا۔ اس شرط پر کہ جب مرشد کے پاس جاؤ تو میرا اسلام عرض کر دینا۔

مرید شاہ نے تڑپ کر سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ چنبیلی حیران و پریشان تھا لیکن پھر خاموشی سے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ بولا، تمہارے بغیر مرشد کے پاس نہیں جاؤں گا۔

مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرے گا رے، ایک بار پھر دھتکار دی جاؤں گی! یہ سن کر مرید شاہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چنبیلی کی آنکھوں کے بند ٹوٹ کر چہرہ پر لگے پاؤڈر کو دھونے لگے۔

شاہ بابا سے ملنے کے شوق میں چنبیلی نے دلہن کی طرح سنگھار کیا۔ بل کھاتی لمبی زلفوں کو سنوارا، کانوں میں لمبے بندے پہنے، ماتھے پر بندیا سجائی، گوٹا لگے لال دوپٹے کا گھونگٹ نکالے جیسے دلہن ہو۔

مرید شاہ نے یہ تیاری دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، لال جوڑا ہر دلہن سہاگ کی خوشی میں پہنتی ہے۔ دلہن کا لال جوڑا نہ جانے کیوں ملن کی آس دلاتا ہے۔ مجھے بھی اپنی طرح تیار کرو، میں آج سہاگن ہونا چاہتا ہوں۔

چنبیلی نے حیرت سے مرید شاہ کو دیکھا اور پھر چہرہ پر سنجیدگی دیکھ کر خاموشی سے اسے تیار کرنے لگا۔

بالوں کی چوٹی باندھی، ماتھے پر بندیا لگائی، ہونٹوں پر سرخی اور سر پر دوپٹا اوڑھا دیا۔ مرید شاہ نے آئینہ میں سراپا دیکھا تو محبوب کے ملن کی تڑپ سے آنکھیں بھر آئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔

پاویں لکھ تو ہار شنگھار کریں، پاویں نخرے ناز ہزار کریں
جنہوں پریتم اپنا نہ سمجھے، اوہ انجے سہاگن ہوئی نہیں

شاہ بابا دکھسرے آپ سے ملنے آئے ہیں۔

وہ مسکرا دیئے اور خادم سے فرمایا،

ان کو عزت و احترام سے اندر لے آؤ۔

مرید شاہ چنبیلی کے ساتھ شاہ بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تو پاؤں میں بندھے گھنگروؤں کی چھن چھن میں عقیدت کا رنگ غالب تھا۔

چنبیلی کے گھنگرو اور مرید شاہ کا ضبط دونوں ٹوٹ جانے کے لئے بے تاب تھے۔ مرید شاہ کی آنکھوں کے ڈورے شدت ضبط سے سرخ ہو گئے تھے۔

شاہ بابا نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا،

مرید شاہ! اللہ کے باغ، کائنات میں لاشمار پھول ہیں۔ ہر پھول خوب صورتی میں اپنی مثال ہے۔ اللہ سے محبت کا مطلب اس کی ہر تخلیق سے محبت ہے۔ اگر کوئی گلاب کا دل دادہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چنبیلی اپنی تخلیق میں نامکمل اور ادھوری ہے، چنبیلی کی اپنی مہک اور خوب صورتی ہے۔

شاہ بابا نے چنبیلی کو شفقت سے دیکھتے ہوئے فرمایا، کائنات کی خوب صورتی کا راز یہ ہے کہ ہر تخلیق دوسرے

سے جدا، مکمل اور منفرد ہے۔سارے مناظر گونگے بہرے ہیولے ہیں۔ یہاں کچھ بھی اچھا اور برا نہیں۔ اچھائی برائی کا تعلق طرز فکر سے ہے۔فرد کی ذات آئینہ ہے، وہ شے کو اپنی طرز فکر کے آئینہ میں دیکھتا ہے جب کہ بے رنگی بتاتی ہے بعض دفعہ اچھے نظر آنے والے کام کو قبولیت نہیں ملتی ۔ بابا بلھے شاہؒ نے گھنگرو پہن کر اور رقص کر کے اپنے مرشد شاہ عنایتؒ کو منایا۔ اصل بات آگہی کی ہے۔ ہر ایک کی اپنی تسبیح ہے۔مرد کبھی ماں نہیں ہوتا، یہ شرف عورت کو حاصل ہے۔اسی طرح باپ کی تسبیح ماں نہیں جپ سکتی۔

بیٹا! یہاں کوئی ادھورا نہیں اور سب ادھورے ہیں۔ بس کرداروں کا فرق حجاب بن کر آنکھوں پر پردہ بن جاتا ہے۔ ہر شے اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، کسی تخلیق کا مذاق اڑانا یا تضحیک جانتے ہو کتنا برا فعل ہے اور اللہ کی ناراضی کا سبب بنتا ہے؟

مرید شاہ کو معافی مل گئی تھی۔مرشد کے تخت پر سر رکھ کر وہ زاروقطار روتا رہا۔انہوں نے محبت سے اپنے خاص مرید کو دیکھا اور سر پر دست شفقت رکھا۔

اس کے بعد وہ چنبیلی کی طرف متوجہ ہوئے۔ بیٹا! ہر کوئی بے اختیاری کے گھنگرو پہن کر محو رقص ہے۔ یہاں کون ایسا ہے جس کے پاؤں میں گھنگرو نہیں۔دکان دار سارا دن ضروریات کے گھنگرو پہن کر بازار میں ناچتا ہے۔ ماں بچہ کی محبت کے گھنگرو پہن کر اس کے گرد گھومتی رہتی ہے۔دنیا پرست کے قول وفعل میں پیسہ کی جھنکار ہے۔جس کو جس سے محبت ہے، اس نے اس کے گھنگرو پہن لیے ہیں۔

شاہ بابا نے مرید شاہ کے پاؤں میں گھنگرو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا، جب مرید توبہ کر کے اپنی انا کو ختم کر دیتا ہے تو ''نچناوی عبادت بن جاندا''

یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مرید شاہ نے جس کی تضحیک کر کے مرشد کی ناراضی مول لی، انہیں میں شامل ہو کر اپنی غلطی کا مداوا کیا اور سیکھا کہ ہر مخلوق اللہ کی ہے، ہر دل میں اللہ بستا ہے۔

شاہ بابا نے فرمایا، کوئی نہیں جانتا کہ بے اختیاری کے یہ گھنگرو کیا ہیں اور کس کے لئے محو رقص ہیں۔اگر ان گھنگروؤں کی چھنک اللہ کو راضی کرنے اور اس کی محبت میں ہو تو رقص محبوبیت بن جاتا ہے۔تمام گھنگروؤں میں یہی ایک ایسا گھنگرو ہے جس کی جھنکار بندہ کو زمین و آسمان کے کناروں سے آزاد کر دیتی ہے۔

چنبیلی کو لگا کہ پوری کائنات میں ہر مخلوق بے اختیار ہے اور سب نے بے اختیاری کے گھنگرو پہنے ہیں۔ مرشد کی محبت کے گھنگرو، ماں کی مامتا کے گھنگرو، باپ کی شفقت کے گھنگرو، ضروریات کے گھنگرو، تعلیم و تربیت کے گھنگرو، ہر طرف چھن چھن کی صداؤں نے نہ جانے کس کی مشیت کا روپ دھار لیا ہے۔چنبیلی نے بے اختیاری کو تسلیم کر کے جس کے پاس اختیار ہے، اس کی محبت میں دھمال ڈالنا شروع کر دیا۔ (آخری قسط)

ڈاکٹر سعیدہ شفیق میمن

صحرائے تھر کی ماروی

اس روز ماروی کو اٹھنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ بیدار ہوتے ہی مٹکا لے کر کنوئیں کا رخ کیا۔ ماروی کی ایک سہیلی کنوئیں کے پاس موجود تھی۔ دونوں باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ اس اثنا میں ان کی نظر دور سے آتے ہوئے اونٹ سواروں پر پڑی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ دھرتی کے عظیم صوفی شاعر ہیں۔ ان کی حیات کا مطالعہ کیا جائے تو اللہ سے عشق و محبت کے ان گنت انداز نظر آتے ہیں۔ شاہ لطیفؒ نے کئی سفر کئے، جن علاقوں میں گئے وہاں کی مشہور داستانوں کو شاعری میں تمثیل میں بیان کیا۔

پڑھنے والوں نے ان کی شاعری کو الگ الگ زاویہ سے دیکھا ہے۔ کسی نے دانش ورانہ پیرائے میں بیان کیا ہے، کوئی قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، کسی کو ان کے کلام میں پند و نصائح نظر آتے ہیں۔ کوئی عشق مجازی کے معنی پہناتا ہے تو کسی کو عشق حقیقی کی تصویر نظر آتی ہے۔ میں جب ان کی شاعری پر تفکر کرتی ہوں تو ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ وہ اللہ رب العزت کے دوستوں میں سے ہیں جنہیں نور فراست سے نوازا گیا ہے، اور ان گتھیوں کو سلجھا چکے ہیں جن کو سلجھانے کی کوشش ہر بندہ کے لئے ضروری ہے۔

مضمون میں شاہ سائیںؒ کے رسالہ ''سرماروی'' میں بیان کردہ رموز پر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سرماروی: سندھ کے صحرا ''تھر'' کے گاؤں ''ملیر'' سے تعلق رکھنے والی خوب صورت لڑکی ماروی کی داستان ہے۔ یہ داستان 1355ء سے 1390ء کے درمیان کی ہے۔ اور یہی عمر سومرو کے دور حکومت کا زمانہ ہے جس کے سبب ماروی کو تلخ حالات سے گزرنا پڑا۔

ماروی، پالنے نامی پھنوار کی بیٹی تھی۔ پالنے کے پاس بکریوں کے علاوہ تھوڑی زمین بھی تھی جس کی دیکھ بھال پھوگ نامی ایک کسان کرتا تھا۔ ماروی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی اور بے حد حسین تھی۔ عمر کے ساتھ حسن دوآتشہ ہوگیا یہاں تک کہ آس پڑوس کے گاؤں میں اس کی خوب صورتی کے چرچے ہونے لگے۔ شاہ سائیںؒ نے ماروی کے حسن کو دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔

ترجمہ: کچے گھر میں رہتی وہ پدمنی، جیسے بجلی کا لپکتا شعلہ، سورج جیسے چمکتا ہوا، ایسے ماروی کی صورت

سے روشنی بکھرتی تھی۔

پھوگ ماروی کو چاہتا تھا۔ ایک دن ہمت کر کے پالنے سے بیٹی کا رشتہ مانگا۔ پالنے نے ماروی کی نسبت بھتیجے کھیت سے طے کردی تھی، سو انکار کردیا۔ پھوگ نے انکار کو انا کا مسئلہ بنالیا اور انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگا۔ ایک دن شاطر دماغ میں خیال آیا کہ ماروی کو حکم ران عمر سومرو کے پھندے میں پھنسواؤں۔ چوں کہ گاؤں کے لوگوں میں کسی کی عزت پر بری نگاہ رکھنا ناقابل معافی جرم تھا، اس لئے پھوگ نے ملیر کو چھوڑ کر عمرکوٹ کا رخ کیا۔ آخر کار اس کی ملاقات عمر سومرو سے ہوگئی۔ اس نے عمر کے سامنے ماروی کے حسن کا ایسا نقشہ کھینچا کہ عمر بن دیکھے اس کے حسن پر فریفتہ ہوگیا اور پھوگ کے ساتھ ملیر جانے کا فیصلہ کیا۔

تھر صحرائی علاقہ ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لئے کنوئیں کھودے جاتے ہیں جو گہرے ہوتے ہیں اور ان سے پانی نکالنے میں وقت لگتا ہے۔ اس لئے تھر کی بیٹیاں پانی بھرنے کے لئے صبح سویرے نکل جاتی ہیں اور جو دیر تک سوتی رہیں، انہیں دوپہر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس روز ماروی کو اٹھنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ بیدار ہوتے ہی پانی کا مٹکا لے کر کنوئیں کا رخ کیا۔ اس کی ایک سہیلی کنوئیں کے پاس موجود تھی۔ دونوں باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ اس اثنا میں ان کی نظر دور سے آتے ہوئے اونٹ سواروں پر پڑی۔ ماروی گھبرا گئی لیکن سہیلی نے ہمت بندھائی کہ لگتا ہے مسافر ہیں۔ پانی پی کر چلے جائیں گے۔ سہیلی کے ہمت بندھانے پر اس نے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ اتنے میں مسافر آپہنچے۔ یہ عمر سومرو کا قافلہ تھا۔ پھوگ نے عمر کو بتایا کہ یہی ماروی ہے۔ وہ اونٹ سے اترا اور ماروی سے پانی مانگا۔ اس نے جیسے ہی پانی کا ڈول عمر کے آگے کیا، عمر نے اسے پکڑا اور اونٹ پر بٹھا کر لے گیا۔ ماروی نے شور مچایا لیکن صحرا میں درختوں کے علاوہ کسی نے آواز نہ سنی!

عمرکوٹ پہنچ کر حکم ران عمر سومرو ماروی کو محل لایا اور کنیزوں سے خیال رکھنے کو کہا۔ ماروی نے محل کی زندگی قبول کرنے سے انکار کردیا اور روتی رہی۔ بات عمر کے علم میں آئی تو اس نے ماروی سے کہا، رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوگا، تمہیں اب یہیں رہنا ہے۔ میں تمہیں ملکہ بنانے کے لئے لایا ہوں۔ تمہارا غلام بن کے رہوں گا۔ مگر ماروی ماں باپ کے پاس جانے کی فریاد کرتی رہی۔ اس نے عمر سومرو کو بتایا کہ میرا رشتہ بچپن میں چچا زاد کھیت کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔ میں اسے چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ کسی کا تصور میرے لئے گناہ ہے۔

عمر سومرو نہ مانا۔ روز منت سماجت کرتا، طرح طرح کے لالچ دے کر راضی کرنے کے جتن کرتا لیکن ماروی پر لالچ اور دباؤ بے اثر رہے یہاں تک کہ اس نے کھانا پینا ترک کردیا۔ بالآخر عمر سومرو کو اس پر ترس آ گیا اور اسے والدین کے پاس چھوڑ آیا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے یہاں انسان کے اصل وطن کی طرف اشارہ کر کے فرد کو اس کی اصل سے جوڑا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بندہ کا اصلی وطن وہ مقام ہے جہاں وہ ''کُن'' سے پہلے موجود تھا۔ جب اللہ نے چاہا کہ ذات وصفات میں چھپے ہوئے خزانہ کو ظاہر کرے تو ''کُن'' فرما کر کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کے بعد عالم ارواح میں مخلوقات کو اپنا دیدار کروایا اور پوچھا، کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب—؟ روحوں نے جواب دیا، جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔

سرماروی کے پہلے حصہ میں شاہ سائیںؒ نے اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ترجمہ:

الست بربکم، آئی جب یہ صدا
قالوابلیٰ قلب سے، تب تھا میں نے کہا
کیا تھا تب وعدہ، میں نے محبوب سے

داستان کے ابیات پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے ان کو لکھتے ہوئے لمحات ازل کا مشاہدہ کیا ہے۔

حضرت شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں،

ترجمہ: جب نہ کن فیکون تھا، نہ روشن ماہتاب، نہ تو فکر گنہ کی تھی، اور نہ ہی غرض ثواب، یکتائی ہی یکتائی تھی، اور نہ تھے اسباب، یار کے راز کا راز تھے ہم بھی، تھا نہ کوئی حجاب، تب سے ہوں بے تاب، تب سے ہے پہچان سجن سے۔

عالم اسباب کے وجود میں آنے سے پہلے کے وقت کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،

''انسان پر زمانہ میں ایک وقت ایسا گزرا ہے جب وہ ناقابل تذکرہ تھا'' (الدھر: ۱)

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''کائنات پرت در پرت عالمین پر مشتمل ہے۔

۱۔ انسان جنت میں آنے سے پہلے کہیں تھا، اس لئے انسان کا حتمی مقام جنت نہیں بلکہ وہ مقام ہے جہاں وہ تخلیق ہونے سے پہلے موجود تھا اور ہے۔

۲۔ مخلوق کے لئے دوسرا مقام کائنات کی تخلیق کا ارادہ ہے۔

۳۔ تیسرا مقام وہ حکم ہے جس کے تحت کائنات تخلیق ہوئی۔

۴۔ کن سے فیکون ہونا چوتھا مقام ہے۔

۵۔ آدم سمیت مخلوقات کا کائنات میں ظاہر ہونا پانچواں مقام ہے۔

۶۔ الست بربکم چھٹا مقام ہے۔

۷۔ اللہ کی ربوبیت کا اقرار ساتواں مقام ہے۔

۸۔ خالق کائنات نے آدم کو علم الاسما (کائناتی علوم) سے نوازا۔ یہ آٹھواں مقام ہے۔

۹۔ آدم کا فرشتوں اور جنات کے سامنے تخلیقی علوم کا مظاہرہ، نواں مقام ہے۔

۱۰۔ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا، یہ بھی ایک مقام ہے۔ اس کے بعد آدم جنت میں داخل ہوا۔''

سرماروی کے مذکورہ بیت میں پہلے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں فرد تخلیق ہونے سے پہلے موجود تھا۔ جس طرح آدم سے غلطی سرزد ہوئی اور ''اھبطوا'' کا امر نافذ ہوا تو وہ جنت سے زمین پر آ گیا۔ اسی طرح ماروی بھی ''محبوب'' کے ساتھ اپنے دیس میں خوش تھی۔

جب وطن سے دور ہوئی تو اس کی آہ وفریاد ایسی تھی جیسے اپنی جنت سے بے دخل ہوگئی ہو۔

ماروی کی مثال یہاں اس فرد کی ہے جو عمر سومرو کے محل کی طرح دنیا کے فریب میں نہیں پھنستی۔ اور رات دن جستجو میں رہتی ہے کہ کسی طرح اصل مقام کی طرف لوٹ جائے — اس حال میں کہ دامن پاکیزہ ہو۔

شاہ لطیف سائیںؒ فرماتے ہیں، (ترجمہ)

کیوں آئی یوں قید میں، برے تھے میرے نصیب
وصل ہو اس یار کا، جو ہے شہ رگ سے بھی قریب
ملے گا کب وہ حبیب، ٹوٹیں گے کب بندھن

یہ وصف ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے کہ رموز کائنات کو سخن میں اس طرح پرو دیا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ماروی کی زبانی وہ آگے لکھتے ہیں، (ترجمہ)

رہنا تھا اس قید میں، یہی تھی میری قسمت
جف القلم بما ھو کائن، یہ لکھ دی گئی عبارت
جن سے میری الفت، وہ ہیں دیس ملیر میں

جف القلم بما ھو کائن سے مراد ہے کہ قلم لکھ کر خشک ہوگیا۔ عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''اس حدیث میں بیان کردہ قلم سے مراد یہ قلم نہیں جس سے ہم لکھتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے کائنات کی ابتدا پر غور کرنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جب مخلوقات، اجرام فلکی، فرشتے، جنات اور انسان پیدا کرنے کا ارادہ ہوا تو اللہ نے ''کُن'' فرما کر کائنات کی ابتدا کی۔ اس کو علم القلم کہا جاتا ہے۔''

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں، (ترجمہ)

آگ میں جھونکوں محل دو محلے، خاک ہوں قصر وایوان
کل شئ یرجع الیٰ اصلہٖ ، ہائے وہ میرے دہقاں
دیکھیں دیس یہ اکھیاں ، میں کھوئی منزل پاؤں

مذکورہ بیت میں شاہ سائیںؒ نے اس حقیقت کا حوالہ دیا ہے کہ ہر شے کو اصل کی طرف لوٹنا ہے۔ مادی دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا آدمی اس حقیقت کو اس دنیا سے ہی جوڑتا ہے۔ درحقیقت انسان کا اصل وطن وہ ہے جہاں سے وہ اس دنیا میں آیا ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ تھر کے رہنے والے نہیں تھے لیکن صحرائے تھر سے وابستہ چیزوں کا مقامی زبان میں بخوبی تذکرہ کیا ہے۔ تھر کی زبان میں وہاں کی بود وباش کو بیان کرنا اعلیٰ پائے کے محقق کا کام ہے۔

شاہ سائیںؒ روح اور جسم کو الگ الگ حیثیتوں میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

ترجمہ: ایک باریک سوئی نے سی دی، ماروسنگ* یہ ہستی، صحرا کی وہ گھاس گولاڑے* ، ان کی یاد ہے ڈستی، جسم یہاں ہے لیکن منوا، بھٹکے صحرا سسّی ، میں ہوں یہاں ترستی، پرمن ہے سنگ ساجن کے۔

اس پورے سُر میں شاہ لطیفؒ نے انسان کو اصل وطن کی طرف دھیان دینے کی طرف متوجہ کیا ہے تاکہ وہ دنیاوی جھمیلوں میں پڑ کر قیمتی وقت کو ضائع نہ کرے۔

---

*ماروسنگ (محبوب کے سنگ) * گولاڑے (جنگلی پھل پھول)

تم تن سے آتے ہو ــــ میں جان سے

سوچا کہ کہاں قسمت آزمائے، کس بادشاہ اور شہزادہ کا درد دیکھے؟ سوچوں میں گم تھا کہ دل میں انجانی بات آئی۔ کہا، آج تک میں بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس جاتا رہا ہوں لیکن کسی سے فیض حاصل نہیں ہوا۔ کیوں نہ کسی بزرگ یا درویش کے در پر حاضری دوں۔

نویں یا دسویں صدی ہجری کی بات ہے کہ گنگوہ میں ایک بزرگ اور جوگی رہتے تھے۔ رہائش ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر تھی۔ جوگی کا علم استدراج پر مبنی تھا جب کہ بزرگ نور سے منور تھے۔

ایک روز بزرگ کا جوگی کی رہائش سے گزر ہوا۔ گھر اور آس پاس کا علاقہ رہنے کے لئے پسند آیا۔ گھر کے باہر چند چیلے بیٹھے ہوئے تھے۔

پوچھا، تمہارا گرو کہاں ہے؟

انہوں نے بتایا، جس جگہ ہم بیٹھے ہیں، ایک سال سے ہمارا گرو اس کے نیچے، جس دم میں مشغول ہے اور تہ خانہ کے دروازے چن دیئے گئے ہیں۔ وہاں پہنچنے کا راستہ نہیں البتہ ہوا کے لئے ایک سوراخ رکھا گیا ہے۔

بزرگ نے سوراخ سے جھانکا، جوگی آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ بزرگ مادی جسم کو مغلوب کر کے زمین میں داخل ہو گئے۔

جوگی نے آنکھیں کھول دیں اور چونک گیا۔ سامنے کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ پوچھا، کون ہو اور اندر کیسے آ گئے؟

بزرگ نے فرمایا، اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ کی قدرت سے یہاں پہنچا ہوں۔

جوگی جان گیا کہ کوئی صاحب علم ہی اس کے حصار کو توڑ کر بند راستوں میں راستہ بنا سکتا ہے۔

بزرگ نے پوچھا، بتاؤ تمہارا علم کیا ہے ــــ؟

وہ بولا، چاہوں تو فوراً پانی بن سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پانی بن گیا۔ بزرگ نے تھوڑا سا کپڑا پانی میں تر کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جوگی پانی سے ٹھوس شکل میں آ گیا۔

بزرگ نے فرمایا، اب میں پانی بنتا ہوں، میرے پانی سے کپڑا تر کر لینا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اس سے تمہیں اللہ کی قدرت معلوم ہو جائے گی۔

وہ پانی میں تبدیل ہو گئے اور جوگی نے کپڑا تر کر کے پاس رکھ لیا۔ بزرگ دوبارہ انسانی شکل میں ظاہر ہوئے اور پاس رکھا کپڑا اسے دیا کہ سونگھو! جوگی نے کپڑا سونگھا تو اس قدر بدبو آئی کہ تعفن سے دماغ پھٹ جاتا۔

فرمایا، اب میرے پانی والے کپڑے کو سونگھو۔

اس قدر خوش بو تھی کہ کسی عطر اور عنبر میں نہ ہو۔ جوگی سرتا پا معطر ہو گیا اور بزرگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خوش بو سے استدراجی علوم کا اثر بھی زائل ہو گیا۔

عرض کیا، میں اپنے فن میں اور آپ اپنے فن میں ماہر ہیں پھر خوش بو اور بدبو کا فرق کس وجہ سے ہے؟

بزرگ نے فرمایا، تمہارا علم شیطانی اور میرا رحمانی ہے۔ تم ''جسم'' میں اور میں ''جان'' میں رہتا ہوں۔

جوگی نے عرض کیا، اپنے جیسا کر دیجئے۔

فرمایا، جو طاقت تم نے حاصل کی ہے وہ صرف اس دنیا تک ہے، اور دنیا کی سڑاند اور بدبو کا تمہیں تجربہ ہو گیا ہے۔ حق کی طرف آؤ کہ ایسے لوگوں کو حاصل ہونے والی خوش بو سب سے بے نیاز کر کے ''ایک'' کا نیاز مند کر دیتی ہے۔

جوگی تہ خانہ سے باہر آیا۔ تہ خانہ سے باہر آ کر چیلوں سمیت حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ چیلوں کی تعداد کم و بیش سات سو تھی۔ بزرگ نے بیعت کے بعد اس کی تربیت فرمائی اور خلافت دے کر چیلوں کی تربیت پر مامور کر دیا۔ اس کے بعد بزرگ جوگی کی اقامت گاہ میں منتقل ہو گئے جو آج بھی سرائے شیخ عبدالقدوسؒ کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی ولادت 860 ہجری میں ردولی میں ہوئی۔ یہ بہلول خان لودھی کا زمانہ تھا جو اس وقت دہلی کا سلطان تھا۔ سلیم الطبع والدین نے بچہ کو تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت دی۔ اس دور میں عربی اور فارسی پر خاص توجہ دی جاتی تھی لہٰذا قرآن کریم پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی ابتدائی کتب پڑھنا شروع کیں۔ علم کے حصول کا بے حد شوق تھا اس لئے اساتذہ معمول سے زیادہ شفقت فرماتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انشا اور مکتوب نویسی سیکھی اور ''بحرالانشعاب'' کے نام سے کتاب لکھی۔

جن دنوں کتاب ''کافیہ'' زیر مطالعہ تھی، معرفت الٰہی کا جذبہ بیدار ہوا۔ دیدار الٰہی کے شوق میں طبیعت میں تبدیلی آئی اور ذہن باطنی علوم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ والد صاحب رحلت پا چکے تھے۔ بیٹے کی اکتسابی تعلیم میں عدم دل چسپی سے والدہ پریشان ہو گئیں لیکن ماموں قاضی دانیال نے بھانجے کے معمولات دیکھ کر تسلی دی کہ یہ اب محفوظ ہاتھوں میں ہے اور اس کا مستقبل مبارک اور سعید ہے۔

جذب و مستی کی کیفیت بڑھ گئی تھی۔ بسا اوقات ردولی سے باہر نکل جاتے۔ ایک بار راستہ میں اجنبی ملا اور پوچھا، کہاں جا رہے ہو—؟

فرمایا، اللہ کی طلب میں گھر سے نکلا ہوں۔

اجنبی نے راہ نمائی کی، اللہ کے طالب ہو تو شیخ احمد عبدالحقؒ کی درگاہ چلے جاؤ، وہ منزل پر پہنچا دیں گے۔

واضح رہے کہ شیخ احمد عبدالحقؒ انتقال فرما چکے تھے۔

انہوں نے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی نسبت اویسیہ کے تحت تربیت کی اور باطنی علوم منتقل کئے۔

شیخ عبدالقدوسؒ فرماتے ہیں،

''میں اکثر ویرانوں، جنگلوں، بیابانوں، مقبروں اور حجرہ میں اکیلا ہوتا تھا لیکن نماز بالخصوص تہجد کا وقت آتا تو شیخ احمد عبدالحقؒ باقاعدگی سے تشریف لاتے، مجھے بیدار کرتے اور کان میں حق حق کی تکرار ہوجاتی۔ بیداری 'آواز' سے غفلت کو دور کردیتی۔''

شیخ عبدالقدوسؒ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے لہٰذا فارسی میں ان کی شاعری موجود ہے۔ ایک کلام کا مفہوم اس طرح سے ہے۔

''منزل عشق ایک ہے۔
خلوت سرا میں انداز محبوبانہ
اور جلوت میں مریض عشق۔
محبوب کے کوچہ میں خود سے میں یہ صدا نہیں لگاتا
بلکہ میری آستین، چوغہ اور دستار
خود بہ خود یہی پکارتے ہیں
ہر ذرّہ میرے نغمہ کی آواز میں مست و بے خود ہے۔
آب و خاک اور آتش مجھ سے کہتے ہیں ــــ مکرر مکرر!''

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ایک مرید عبدالستار سہارن پوری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جمعرات کو بہت سے لوگ درگاہ شیخ احمد عبدالحقؒ میں حاضر تھے۔ مزار مبارک شق ہوا، شیخ قبر سے باہر تشریف لائے اور عبدالقدوسؒ کی طرف متوجہ ہوکر شعر پڑھا،

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

ترجمہ: مجھے اپنی طرح سے زندہ سمجھو، تم تن سے آتے ہو، میں جان سے آتا ہوں۔

عبدالقدوسؒ پر لرزہ طاری ہوا اور بے اختیار شیخ کے قدموں میں گر گئے۔ شیخ احمد عبدالحقؒ نے شفقت سے ہاتھ تھاما اور فرمایا کہ میں نے ذمہ داری پوری کی اور تجھے مطلوب تک پہنچادیا۔

شیخ عبدالقدوسؒ خانقاہ کے کاموں میں بنفس نفیس شریک ہوتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ ایک بار چلہ میں کھانا پینا کم سے کم کردیا جس سے مزاج میں حدت پیدا ہوئی۔ اندرونی سوزش کی وجہ سے جسم میں سے بھاپ نکلتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ موسم سرما میں صبح کے وقت سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا تو وہ گرم ہوجاتا تھا۔

شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ بعد ازاں شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحقؒ سے بیعت ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ علاوہ ازیں دوسرے مشائخ عظام سے بھی خلافت ملی۔

سکندر لودھی کا دور حکومت تھا۔ امیر عمر خان بادشاہ سے ناراض ہوکر چلا گیا۔ گردش حالات میں ایسا آیا کہ جہاں جاتا، کام یابی نصیب نہ ہوتی۔ سوچا کہ کہاں

قسمت آزمائے، کس بادشاہ اور شہزادہ کا در دیکھے؟ سوچ میں گم تھا کہ دل میں انجانی بات آئی۔ کہا، آج تک میں بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس جاتا رہا ہوں لیکن کسی سے فیض حاصل نہیں ہوا۔ کیوں نہ کسی بزرگ یا درویش کے در پر حاضری دوں۔ کیا معلوم نیک بندوں کے طفیل میری قسمت جاگ جائے۔

گھومتا پھرتا ردولی پہنچا۔ لوگوں سے دریافت کیا بھائیو! کیا ردولی میں کوئی اللہ کا بندہ ہے جو مجھے بے سکونی کے گرداب سے نکالے۔۔۔؟ سب نے حضرت عبدالقدوسؒ کی خانقاہ جانے کا مشورہ دیا۔

عمر خان خدمت میں حاضر ہوا۔ دل نے گواہی دی کہ یہی وہ بندہ ہے جو سکون آشنا کردے گا۔

قدموں میں گر گیا اور ہچکیوں سے فریاد کی کہ مجھے تھام لیجئے، گھر بار رہا نہ ٹھکانا، سائے میں جگہ دے دیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے فرمایا، ارے نادان اٹھ! کیوں بے صبرا ہوتا ہے۔ اللہ کی زمین پر میرے لئے جگہ ہے تو تمہارے لئے کیوں نہیں ہوگی۔ رب کائنات کے نزدیک سب برابر ہیں۔ بے فکر ہو کر جا، تیرا کشکول کبھی خالی نہ رہے گا، اللہ کی عبادت کر اور اس سے مدد مانگ، ہم کون ہوتے ہیں تجھے غم و مصائب سے نجات دلانے والے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر پتا نہیں ہلتا۔

عمر خان کے بدنصیبی کے دن گزر گئے۔ بادشاہ سکندر لودھی کی طرف سے تحائف بھیجے گئے، دربار میں بلایا گیا اور خوب عزت و احترام ملا۔

عمر خان خوشی سے نہال ایک بار پھر پرنم آنکھوں سے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پاس حاضر ہوا۔

حضرت! آپ کے طفیل عزت و مرتبہ حاصل ہوا۔ آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ میرے ساتھ شاہ آباد (ضلع کرنال) چلیں تاکہ وہاں کے لوگ فیض پائیں۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اس کی بات مان لی اور علم و عرفان کی روشنی سے شاہ آباد کو منور کیا۔ قرب و بعد سے لوگ آتے اور فیض پاتے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ 934ھ تک شاہ آباد میں مقیم رہے۔ 934ھ میں ایک مرید ملک عثمان کرانی نے جو گنگوہ کے رہنے والے تھے، درخواست کی کہ اگر آپ کے صاحب زادوں میں کوئی گنگوہ میں سکونت اختیار کرے تو وہاں لوگوں کی تعلیم و تربیت ہوگی۔ صاحب زادہ شیخ رکن الدین کو بھیجا۔ بعد میں دیگر بھائی بھی آ گئے لیکن کسی کا دل گنگوہ میں نہ لگا۔ سب بار بار شاہ آباد واپس آ جاتے۔ ایک روز شاہ عبدالقدوسؒ نے صاحب زادوں سے فرمایا، کیوں گنگوہ سے لوٹ آتے ہو، اسی قصبہ کو تمہارا وطن بننا ہے۔

شاہ آباد میں قیام کو طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اہلیہ کو کشف ہوا کہ خراسان سے آگ اٹھی ہے اور ہر چیز کو جلاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔

کیفیت سے مطلع کیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا، جس قدر جلدی ہو سکے، بچاؤ کا انتظام کرلو۔ کوئی آفت

نازل ہونے والی ہے۔

اور پھر تیموری سلسلہ کے بادشاہ بابر نے ہندوستان پر ایسی یلغار کی کہ سامنے آئی ہر چیز کو خاک بنا دیا۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا، بستیاں تباہ ہوگئی تھیں۔

آپ شاہ آباد سے گنگوہ تشریف لے آئے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حجرہ کی تعمیر کے لئے ملک مبارک خضر آبادی نے شہ تیر بھیجے۔ حاکم وقت عقیدت مند تھا، اس نے معماروں کو حجرہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ شہ تیر چھوٹے ثابت ہوئے۔ معماروں نے کوشش کے بعد جواب دے دیا کہ جب تک نئے شہ تیر نہیں آجاتے حجرہ نہیں بن سکتا۔

شیخ عبدالقدوسؒ کے علم میں بات آئی تو فرمایا کہ ہم درویش ہیں، ایک مرید نے یہ شہ تیر بھیجے ہیں، ہم دوسرے شہ تیر کہاں سے لائیں۔ لیکن ہاں! جب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے لکڑی جنگل میں لمبی ہوسکتی ہے تو اس کی قدرت سے یہاں بھی لمبی ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد جائے تعمیر پر پہنچ کر عصا سے شہ تیر کو ناپا اور فرمایا کہ اسے دیوار پر رکھو۔ معماروں نے دیوار پر رکھا تو اللہ کی قدرت سے لکڑی اس قدر دراز ہوئی کہ دیوار سے باہر تک نمایاں ہوگئی۔

توجیہ: ہر شے معین مقداروں پر قائم ہے۔ درخت یا لکڑی بھی سانس لیتے ہیں، اور ان میں زندگی کے تقاضے موجود ہیں۔ لکڑی جہاں کہیں ہے، ہر لحہ گھٹنے اور بڑھنے کے عمل سے گزرتی ہے۔ ایک مثال سردیوں اور گرمیوں کی بھی ہے۔ سردیوں میں لکڑی سکڑتی ہے جب کہ گرمیوں میں ہوا میں نمی کے سبب پھیلتی ہے۔ غرض شیخ عبدلقدوسؒ مقداروں کے علم سے واقف تھے، انہوں نے اللہ کے فضل و کرم سے لکڑی کی مقدار میں تصرف فرمایا اور طوالت بڑھ گئی۔

بھولا نامی مرید مالیخولیا میں مبتلا ہوگیا۔ رشتہ دار چارپائی پر رسیوں سے باندھ رکھتے تھے۔ ایک روز بھولا نے کشف کی حالت میں دیکھا کہ شیخ نے رسیاں کھول دی ہیں۔ اس دوران دو حضرات آئے اور دوبارہ باندھنا چاہا لیکن شیخ گنگوہیؒ نے روک دیا۔

انہوں نے کہا ہم مریض کی پیشانی کو داغیں گے۔

فرمایا، آگ ہمارے مریدین کے نزدیک نہیں آتی۔

جب دونوں حضرات کا اصرار بڑھ گیا کہ یہ اس کی ضرورت ہے تو فرمایا، اچھا انگوٹھے سے متصل پاؤں کی انگلی داغ دو۔ انہوں نے تعمیل کی۔ پھر شیخ نے تعویذ دیا اور بعض واقعات سے متعلق خبردار کیا کہ آئندہ یہ حالات پیش آئیں گے۔ بھولا نے تعویذ سر سے باندھا تو کشف کی کیفیت ختم ہوئی۔ دیکھا کہ رسیاں کھلی ہوئی ہیں، بیماری رفع ہوگئی ہے اور تعویذ سر سے بندھا ہوا ہے۔

قارئین سوچئے کہ ''کشف'' اور ''بیداری'' کی دنیا کیا فرق ہے ــــ؟

ایک مرید پر کسی خاتون نے تہمت لگائی۔ قاضی نے قید کی سزا سنادی۔ قید خانہ میں دستور تھا کہ لوہا گرم کر کے قیدی کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ بھورے کے ہاتھ پر لوہا رکھا جانے لگا تو شدت سے پیرومرشد کو یاد کیا۔

آواز آئی، فکرمت کرو خیر ہوگی۔

بھورا کو حوصلہ ملا۔ لوہا گرم اور سرخ ہوا اور آگ سے نکالا گیا تا کہ قیدی کے ہاتھ پر رکھیں۔ اللہ کی قدرت سے لوہے میں آگ سرد ہوگئی۔

مرید بے قصور تھا، رہائی مل گئی۔

روایت ہے کہ ایک رات شیخ خان اپنے حجرہ میں تھے کہ پردہ اٹھا، دیکھا کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنے مقام پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں۔

صبح حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ گزشتہ رات آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ ساری رات آپ چراغ سامنے رکھ کر مطالعہ میں مصروف رہے۔

انہوں نے فرمایا، ہم تو سوئے ہوئے تھے۔ تم نے ہماری روحانیت کو دیکھا۔

قارئین ! نیند دراصل پردہ ہے اور اللہ کے دوست پس پردہ حقیقت سے واقف ہوجاتے ہیں اس لئے ہر عالم میں ایک طرح رہتے اور دیکھتے ہیں۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ یادالٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اولیاء اللہ ظاہری طور پر مخلوق کی خدمت میں مصروف اور بباطن یادالٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔

ان کے ایک کلام کا مفہوم پڑھئے۔

''خود کو چھپاتے ہو اور ناز و انداز سے ظاہر بھی ہوجاتے ہو۔ بہار میں پھول بن کر صحن گلزار میں آتے ہو لیکن خزاں میں بلبل بن کر گریہ وزاری بھی کرتے ہو۔ آئینے بہت ہیں لیکن سب میں جلوہ تمہارا ہے۔ قدوس فقیر کہتا ہے کہ فنا و بقا کے اس کھیل میں ہم خود آزادی وقید میں گرفتار ہوگئے۔''

''اگرچہ تو خوش نصیبی کا بادل بن کر بحر و بر پر برسا ہے لیکن میں اب تک دید و سیرابی سے محروم ہوں۔ جب سے تو مجھ سے جدا ہوا ہے، فراق میں ہر وقت خون جگر پیتا ہوں۔''

وصال سے تین سال پہلے خاموشی اختیار کر لی۔ ہر وقت مستغرق رہتے تھے۔ ایک کلام میں فرماتے ہیں،

''رات کی تاریکی جب دنیا پر چھاتی ہے تو یہ محبوب کی ایک زلف ہے میں جس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ تیرے بغیر حور کا حسن کیا! میرا اندر باہر سب تیرے رخ روشن کی دید میں مست ہے۔''

23 جمادی الآخر، 944ھ کو وفات پائی۔ عمر چوراسی سال تھی جس میں سے پینتیس سال ردولی، پینتیس سال شاہ آباد اور چودہ سال گنگوہ میں بسر کئے اور ہر جگہ خلق خدا کی خدمت کی۔ مزار قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور محلّہ سرائے میں ہے۔

حامد ابراہیم

ایک لاکھ بہتر ہزار آٹھ سو ساکن تصاویر ــــ؟

فلم پر ایک سیکنڈ میں اوسطاً چوبیس تصاویر منتقل ہوں تو دو گھنٹے کی فلم میں 7200 سیکنڈ بنتے ہیں۔ چناں چہ چوبیس تصاویر فی سیکنڈ کے حساب سے ایک سو بیس منٹ کی فلم، ایک لاکھ 72 ہزار آٹھ سو ساکن تصاویر (still shots) پر مشتمل ہے۔

بیلٹ کے دونوں سرے تاریکی میں ہیں۔ تاریکی میں سے شے ظاہر ہوتی ہے اور پھر تاریک ہوجاتی ہے۔ تاریکی کا تعلق نظر سے ہے۔ حالاں کہ تاریکی اپنی جگہ مکمل زون ہے کیوں کہ اسی تاریکی سے چیزیں ظاہر ہورہی ہیں۔ بیلٹ کا درمیانی حصہ زندگی اور موت کا مرکب ہے۔ اس مرکز پر زندگی موت سے ملتی ہے اور پھر زندگی بن جاتی ہے۔ زندگی کی ابتدا ہوتے ہی موت کا عمل بھی متحرک ہوجاتا ہے۔

اللہ رب العالمین فرماتے ہیں:

''وہ زندہ کو مردہ میں سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ میں سے نکال لاتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، اسی طرح تم لوگ بھی نکال لیے جاؤ گے۔'' (الروم: ۱۹)

فرد اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ وہ ہر لمحہ موت و حیات سے گزرتا ہے۔ ایک لمحہ کا دوسرے لمحہ میں داخل ہونا موت، اور دوسرے لمحہ کا ظاہر ہونا پیدائش ہے۔ دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے فرد جس حالت میں تھا، وہ اِس دنیا کے لئے غیب ہے۔ غیب اس مقام کو کہتے ہیں جس سے ہم واقف نہ ہوں۔

غیب و شہود کا تعلق واقفیت و ناواقفیت سے ہے۔

یہاں آنے سے پہلے ہم اِس عالم کے لئے مردہ لیکن دوسرے عالم میں زندہ تھے۔ مقام کی تبدیلی کے لئے موت سے گزرنا ضروری ہے اور موت پردہ ہے۔

موت پردہ کیوں ہے اور یہ پردہ کس چیز کا ہے ــــ؟

پردہ دراصل لباس ہے کیوں کہ ہر جگہ رہنے کے قوانین مختلف ہیں۔ فرد جب روشنی کی دنیا سے مٹی کی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے تو روشنی کا جسم مغلوب ہوجاتا ہے۔ مٹی سے روشنی کی دنیا میں واپس جاتا ہے تو مٹی کا لباس مغلوب ہوجاتا ہے۔ وہ مٹی کے ساتھ روشنی کی دنیا میں نہیں جاسکتا اور روشنی کا لباس مٹی کی دنیا میں رہنے والے کو نظر نہیں آتا۔ ایسے میں لباس حقیقت کو دیکھنے کے لئے پردہ بن جاتا ہے۔

موت درحقیقت لباس کا مغلوب ہونا ہے کیوں کہ زندگی ہر عالم میں حیات ہے۔

ظاہر ہونے کے بعد غیب ہونا ضروری ہے ورنہ زندگی آگے نہیں بڑھتی۔ زندگی اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب موت سے گزرتی ہے۔ غیب ظاہر غیب کی مساوات ہم پڑھ چکے ہیں جس میں ظاہر کے دونوں اطراف غیب ہے مگر درمیان میں وقفہ کی بنا پر یہ الگ نظر آتے ہیں۔ اس قانون کو سمجھنے کے لئے فلم کی مثال سامنے ہے لیکن پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فلم اور اس کا میکانزم کیا ہے—؟

فلم کی بنیاد ساکن تصویریں ہیں۔ تصویر کی ایک وضاحت یہ ہے کہ یہ مخصوص خدوخال اور اشکال پر مشتمل ہوتی ہے جس کے معنی دیکھنے سے متعین ہوتے ہیں۔ دوسری وضاحت یہ ہے کہ تصویر خاص لمحہ کا عکس ہے جو پلیٹ، فلم یا اسکرین پر حاصل کیا گیا ہے۔

تسلسل سے کسی واقعہ کی تصاویر کھینچیں، ان کے درمیان وقفہ کم سے کم ہو، پھر انہیں اسی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ دیکھیں تو تصاویر کے متحرک ہونے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ تصویریں ساکن ہیں لیکن ترتیب اور تسلسل کی بنا پر دماغ انہیں متحرک سمجھتا ہے۔ بصریات میں اسے فریب بصر (optical illusion) کہتے ہیں۔

کیمرہ ایک وقت میں ایک عکس اسکرین پر منتقل کرتا ہے۔ یہ وقت اپنی مقدار میں جتنا کم ہوتا ہے، کیمرے کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے۔ سادہ الفاظ میں کہیں گے کہ جو کیمرا ایک سیکنڈ میں جتنی تصاویر لے سکتا ہے وہ اتنا ہی تیز رفتار اور فلم سازی کے لئے موزوں تر ہے۔

سوال ذہن میں آتا ہے کہ جس دورانیہ کو ثانیہ (سیکنڈ) کا نام دیا گیا ہے، وہ خود کتنے وقفوں یا لمحات پر مشتمل ہے—؟ اور ایسے چھوٹے سے چھوٹے وقفہ یا لمحہ کی اصل مقدار کیا ہوگی جسے ہم حتمی طور پر سب سے چھوٹا لمحہ قرار دیں—؟

کوانٹم فزکس کے محققین کے مطابق وقت اور فاصلہ لازم وملزوم ہیں۔ مادی تحقیق کی رو سے وقت کی سادہ تعریف یہ ہے کہ دو نکات کے درمیان موجود فاصلہ جتنے وقفے میں طے ہوتا ہے، اسے وقت کہا جاتا ہے۔

فاصلہ طے کرنے کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے، وقت اتنا مختصر ہوتا ہے۔ چناں چہ مادی تحقیق وتلاش کے مطابق فاصلہ یا لمبائی کی سب سے چھوٹی اکائی کو ممکنہ تیز ترین رفتار سے طے کیا جائے تو جو وقت صرف ہوا، وہ اپنی مقدار میں سب سے چھوٹا لمحہ کہلاتا ہے۔ ایسا لمحہ جسے محقق وقت کی سب سے چھوٹی اکائی قرار دے سکیں۔

محققین روشنی کو کائنات میں تیز ترین شے خیال کرتے ہیں۔ کوانٹم فزکس کے ماہرین نے فاصلہ یا لمبائی کی سب سے چھوٹی مقدار کو پلانک کی لمبائی (Planck length) کا نام دیا ہے۔

سادہ الفاظ میں یہ ایک الیکٹران کے نصف قطر سے کھربوں سنکھوں گنا چھوٹی مقدار ہے۔

واضح رہے کہ یہ ایسا نظریہ ہے جو عملی طور پر ثابت نہیں ہوا۔ اب تک کوئی کیمرا ایجاد نہیں ہوا جو اس مختصر ترین وقفہ سے تصاویر کھینچنے کی رفتار کا حامل ہو۔

رفتار کے حوالہ سے ابھی تک ایجاد ہونے والے حساس ترین کیمرے کی رفتار 10 ٹریلین یا 100 کھرب تصاویر فی سیکنڈ ہیں۔ اس کے موجد کیوبک یونیورسٹی کینیڈا کے محققین ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کیمرا کاغذ کی موٹائی جتنے فاصلہ سے گزرتی ہوئی روشنی کی تصویر لے سکتا ہے۔ تاہم ان کے مطابق اس کا استعمال ابھی لیبارٹری اور تحقیق کی سطح تک ہے۔

فی الوقت اس دعویٰ کی کوئی سند سامنے نہیں۔

عموماً فلم سازی (cinematography) کے لئے استعمال ہونے والے کیمرے ایک سیکنڈ میں چوبیس تصاویر کھینچ کر فلم پر منتقل یا ڈیجیٹل ڈیٹا میں محفوظ کرتے ہیں۔ فلم پر ایک سیکنڈ میں اوسطاً چوبیس تصاویر منتقل ہوں تو دو گھنٹے کی فلم میں 7200 سیکنڈ بنتے ہیں۔ چناں چہ چوبیس تصاویر فی سیکنڈ کے حساب سے ایک سو بیس منٹ کی فلم، ایک لاکھ 72 ہزار آٹھ سو ساکن تصاویر (still shots) پر مشتمل ہے۔

جب فلم کی ریل پروجیکٹر میں لگائی جاتی ہے تو روشنی کی تیز بیم ریل میں سے گزر کر تصویروں کو اسکرین پر بکھیر دیتی ہے۔

سنیما ہال میں ناظرین، فلم میں تصاویر کی تعداد، پروجیکٹر کی رفتار اور میکنزم سے بے نیاز، اسکرین پر منعکس تصاویر کو تسلسل میں چلتی پھرتی حالت میں دیکھتے ہیں۔ فلم ختم ہوتی ہے تو لوگ فلم کے مندرجات، موضوع اور کرداروں کے نقوش ذہنوں میں لیے ہنسی مذاق کرتے ہوئے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

سنیما ہال میں دوسرے شو کا آغاز ہوتا ہے۔ ریل دوبارہ سے پروجیکٹر میں لگائی جاتی ہے۔ اب اس فلم کو نئے ناظرین دیکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پہلے شو کے ناظرین کے لئے جو فلم ختم ہو کر ماضی بن گئی وہی فلم نئے ناظرین کے لئے حال اور مستقبل کس طرح ہے — ؟

ابدالِ حق آدمی کو متوجہ کرتے ہیں کہ،

آنا ہے ترا عالم روحانی سے
حالت تری بہتر نہیں زندانی سے
واقف نہیں میں وہاں کی حالت سے عظیمؔ
واقف ہوں مگر یہاں کی ویرانی سے

فلم بذات خود کیا ہے — ؟ پہلے سے ریکارڈ شدہ دستاویز یعنی ماضی ہے۔ تمام تصاویر کھینچی جا چکی ہیں جن میں ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ ہر تصویر ایک عمل، ایک صورت حال، ایک لمحہ کا عکس اور بیان ہے البتہ فلم کی صورت میں ظاہر ہونے کے لئے ان کا ترتیب اور

ایک دوسرے سے ربط میں رہنا ضروری ہے۔

دیکھنے والا نہیں سوچتا کہ فلم میں تصاویر کی تعداد، تصاویر میں کردار، فلم کا موضوع، مقصد، کہانی کا آغاز — ان کی تشکیل کے دوران فلم کن نشیب و فراز سے گزری —؟

جواب یہ ہے کہ فلم — فلم ساز کے ذہن کا عکس ہے۔ فلم ساز کو خیال آیا کہ فلاں موضوع پر فلاں مقصد کے تحت فلم بنانی چاہئے اور اس میں اتنے کرداروں کی ضرورت ہے۔ اس نے صلاحیتیں اور وسائل بروئے کار لاتے ہوئے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کیا۔ کہانی اور کردار نگاری کی تکمیل ہوئی، تکنیکی لوازمات، ہدایت کاری، اداکاری، عکس بندی وغیرہ کے بعد فلم ریکارڈ ہوگئی۔ ریلیز کے لئے سنیما گھروں کا انتخاب ہوا اور تاریخ مقرر کی گئی۔ تشہیر کی گئی اور لوگوں نے سنیما گھروں کا رخ کیا۔ فلم کی ریل جب تک پروجیکٹر میں چلنا شروع نہیں ہوئی، فلم کی حیثیت ناظرین کے لئے غیب ہے۔

ناظرین فلم اس وقت دیکھتے ہیں جب ایک منظر غیب میں جائے، دوسرا غیب سے ظاہر ہوکر غیب ہو اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔ حتیٰ کہ آخری منظر کے بعد ساری فلم غیب ہوجاتی ہے۔

اسی طرح فلم پروجیکٹر پر چلنے سے پہلے ناظرین کے لئے موجود نہیں۔ پروجیکٹر پر چلتی ہے تو ہم اس کو فلم یا زندگی کہتے ہیں۔ ابدالِ حق فرماتے ہیں،

یہ دور جہاں کیا ہے، بتا اے ساقی
اس راز کو ہم سے نہ چھپا اے ساقی
یہ دور پیالے سے ہے ملتا جلتا
اس دور کو توڑ کر دکھا اے ساقی

جس کیمرے سے فلم بندی کی گئی اس نے ایک سیکنڈ میں چوبیس تصاویر فلم کی پٹی پر منتقل کیں۔ ہم فلم دیکھتے ہوئے ایک سیکنڈ میں الگ الگ چوبیس تصاویر نہیں دیکھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی تصویر سامنے موجود ہے۔ فیتہ پروجیکٹر میں مسلسل اور مخصوص رفتار سے حرکت نہ کرے تو فلم نہیں دیکھی جاسکتی۔ یعنی حرکت کے بغیر فلم — فلم نہیں۔

مادی شعور اور نظر چوبیس تصاویر کو ایک سیکنڈ میں الگ الگ دیکھنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اگر فی سیکنڈ تصاویر کی تعداد مادی شعور کی رفتار سے بڑھادی جائے تو ناظرین ہر منظر کو الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور نہ ان میں تمیز کرسکتے ہیں۔

یہ کہا جائے کہ کائنات کثیر ابعاد (ڈائی مینشن) یا کم از کم ابعاد ثلاثہ (تھری ڈائی مینشنل) پر مشتمل فلم ہے تو غور و فکر کرنے والا ذہن سوچتا ہے کہ اس فلم میں فی سیکنڈ اطلاعات کی رفتار کیا ہے —؟

''یہ بات بہت غور طلب ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ محوری اور طولانی گردش میں سفر کررہا ہے۔ محوری گردش کا مطلب یہ ہے کہ حرکت کا ایک نقطہ سے شروع ہوکر اسی نقطہ پر ختم ہونا۔ محوری گردش کا

یہ قانون پوری کائنات کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ نزول وصعود کا یہ عمل ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں واقع ہوتا ہے اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں دوبارہ پلٹ جاتا ہے اور بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ بار بار اس کا اعادہ جس رفتار سے ہوتا ہے وہ رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ ہم ہر ایک چیز کو اپنے سامنے ساکت محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ کائنات میں کوئی شے ساکت نہیں ہے۔ کائنات میں اگر کوئی شے ساکت ہو جائے تو پوری کائنات فنا ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ کائنات کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہم اسے ساکت محسوس کرتے ہیں۔''

(نظریۂ رنگ ونور)

قارئین! فیتہ پر ہر تصویر دراصل پروڈیوسر کے ذہن میں موجود ایک خیال ہے۔ کائنات بھی خیالات پر مشتمل پروگرام ہے جو مسلسل نشر ہو رہا ہے اور یہ نشریات غیب ظاہر غیب کے میکانزم پر قائم ہیں۔

عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''زندگی کی تعریف یہ ہوگی کہ زندگی مرنے، غائب ہونے، ظاہر ہونے، پھر مرنے، پھر ظاہر ہونے، پھر غائب ہونے کا نام ہے۔ پھر عمر کا یہ کھیل کیا ہوا—؟ یہ آپ کو سوچنا ہے۔ زندگی ایسی چھپن چھپائی کا کھیل ہے کہ آدمی دو دفعہ غائب ہو کے ایک دفعہ ظاہر ہو رہا ہے۔''

کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دنیا کرے تلاش نیا جام جم کوئی
اس کی جگہ نہیں میرے جام سفال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قید محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سراب خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

اہل چمن ہمیں نہ اسیری کا طعن دیں
وہ خوش ہیں اپنے حال میں ہم اپنی چال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسم خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمہیں ہو خیال میں

دنیا ہے خواب، حاصل دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیمؑ پر
شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں

عمر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

سیمابؔ اجتہاد ہے حسن طلب مرا
ترمیم چاہتا ہوں مذاق جمال میں

(کلام: سیمابؔ اکبرآبادی)

نفیسہ شاکر

لہسن اور پیاز کی بو

مردوں سے سوال ہے کہ جو ستارے شادی سے پہلے اتنے قریب نظر آتے تھے کہ انہیں توڑ کر لانا مشکل نہیں تھا، اب وہ دور کیسے ہو گئے ـــ؟

کیا آپ نے سوچا ہے کہ بعض شادیوں کا اختتام طلاق پر کیوں ہوتا ہے یا پھر میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی کیوں نہیں ہوتی ـــ؟ کیوں کہ شوہر اور بیوی دونوں اعصابی مسائل کا شکار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی غفلت کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ مسلسل ایک دوسرے کے اعصاب پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

اعصابی مسائل میں مبتلا افراد میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ جذباتی ہوتے ہیں اور مزاج کے خلاف بات برداشت نہیں کرتے۔ خود بھی ذہنی دباؤ میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے رویہ سے متاثر کر کے دباؤ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، اس عمل سے ان کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ سوچئے کہ یہ کس قدر خطرناک عمل ہے اور کتنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

ازدواجی زندگی میں ناکامی یا پریشانی کے بنیادی عوامل یہ ہیں۔

۱۔ ایسے افراد خود پسند ہوتے ہیں اور اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں۔ حالات کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتے اور رفتہ رفتہ فریق ثانی کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ مرد یا عورت اعصابی مسائل کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جسمانی بیماری کی شکایت لے کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ناخوش گوار ازدواجی تعلقات کا اظہار ہے۔

۲۔ شوہر اور بیوی رشتۂ ازدواج کو برقرار رکھنے کے باوجود مختلف دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلق میں کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ شوہر خانگی مایوسی کو محبت کر کے دور کرنا چاہتا ہے اور عورت اپنی بے اعتمادی کو یہ کہہ کر رفع کرنا چاہتی ہے کہ گھر میں اس کے کام کو سراہا نہیں جاتا نہ اسے محبت نصیب ہوتی ہے۔

۳۔ اجارہ داری کی کوشش میں شوہر بیوی دونوں میں سے ایک حاکم اور دوسرا مظلوم ہوتا ہے۔ فرد کسی پر اس وقت حاکمیت جتاتا ہے جب وہ عدم تحفظ کا شکار ہو۔ ایسے میں رشتہ کا احترام نہیں رہتا۔

۴۔ شکوک وشبہات زیادہ ہوتے ہیں جس سے اعتماد متاثر ہوتا ہے اور اعتبار نہیں رہتا۔ خلوص سے کئے گئے

عمل کو بھی وہ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر دوسرا فرد ان حالات کا سبب نہیں تو یہ رویہ اسے مایوس کرتا ہے۔

۵۔ دونوں اپنی بات منوانا چاہتے ہیں لیکن ایثار نہیں کرتے۔ عائلی زندگی میں مسائل ہر دور میں رہے ہیں کیوں کہ دو مختلف مزاج ملنے سے ٹکراؤ ہوتا ہے لیکن پہلے ایثار زیادہ تھا اس لئے ایک وقت کے بعد ذہن، ذہن سے مل جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مردوں کی بیویاں انگوٹھا چھاپ ہوتی تھیں مگر آج انگوٹھا چھاپ مرد سے ماسٹرز تو دور کی بات، گریجویٹ خاتون بھی شادی پر رضامند نہیں ہوتی۔

۶۔ ہر وقت شکوے شکایات کا ہونا تعلق کو کم زور کرتا ہے۔ ایسے لوگوں سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ جب یہ رویہ شوہر اور بیوی کے درمیان ہو تو سوچئے کہ پھر دونوں میں سے جو فریق متاثر ہے، وہ کہاں جائے!

۷۔ رویوں اور معاملات میں عدم توازن سے گھریلو زندگی متاثر ہو جاتی ہے۔ جس کا جو وقت ہے، وہ اسے دیا جائے۔ معاملات میں جانب داری نقصان دہ ہے۔ ایسا رویہ اپنائیں کہ تصادم کی نوبت کم سے کم ہو۔ جیسے بعض مرد بیگم کو خوش کرنے کے لئے ہر جگہ ان کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں جیسے لباس، ٹائی یا جوتے وغیرہ کا انتخاب ان کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ بیگم کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہم سب کچھ تمہاری مرضی سے کرتے ہیں۔ اس عادت کے حامل شوہر اگر یہ تحریر پڑھ رہے ہیں تو ضرور اس بات پر مسکرائیں گے کیوں کہ اس نکتہ کا آخری جملہ بامعنی ہے۔

۸۔ شوہر اور بیوی کے رشتہ میں دیگر لوگوں کا منفی کردار گھر کے سکون کو برباد کر دیتا ہے۔ شوہر یا بیوی کا دوسروں کی باتوں میں آکر فریق کے ساتھ زیادتی ان کے رشتہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ البتہ اچھی صلاح دینے والوں کے لئے راستہ ضرور کھلا رکھیں، ناچاقی کی صورت میں یہی لوگ مصالحت کراتے ہیں۔

۹۔ خاندانی نظام کا متاثر ہونا بھی ناکام شادیوں کی ایک وجہ ہے۔ پہلے خاندان والے مل بیٹھ کر اختلافات حل کروا دیتے تھے۔ اب خاندانوں میں دراڑ ہے۔

جب اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو پہلی کے بعد دوسری شادی بھی ناکام ہو جاتی ہے کیوں کہ فرد خامی کو خامی نہیں سمجھتا۔ لہٰذا رشتہ کوئی بھی ہو، اپنا محاسبہ ضرور کریں۔

ꕥ

بیویوں کی عادات و اطوار اور مزاج کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ شوہر کے خلاف بیوی: ایسی بیوی لاشعوری طور پر مرد کی مخالفت کر کے تسکین حاصل کرتی ہے۔ مرد پر حکومت کرنا ان کے دماغ میں ہوتا ہے۔ وہ فطرتاً حجت پسند اور سرد مہر ہوتی ہیں۔

۲۔ وہمی و شکی بیوی: ایسی بیوی کو مستقلاً علالت کی شکایت رہتی ہے۔ ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر کے پاس علاج کے واسطہ جاتی ہے مگر اس کو کوئی اس بات کا یقین نہیں دلا سکتا کہ وہ تن درست ہے۔ شوہر کی ہر

بات پر شک کرتی ہے جس سے عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ بیگم کو یقین دلاتے دلاتے ایک وقت کے بعد شوہر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ جاذب نظر بیوی: ایسی بیوی خوب صورت ہو تو زیادہ تر وقت آئینہ کے سامنے گزرتا ہے۔ ہمیشہ خود آرائی میں منہمک رہتی ہے۔ کپڑے، بال، ناخن اور چہرہ کو سنوارتی ہے۔ اور اگر خوب صورت نہیں ہے تو زیادہ تر وقت خود کو جاذب نظر بنانے میں گزارتی ہے۔ بچپن سے اپنی خوب صورتی کا چرچا سنتی ہے لہٰذا اس کے ذہن میں اپنی پرستش کی خواہش گہری ہو جاتی ہے۔ وہ پرستش اور تعریف چاہتی ہے۔ شوہر سمجھ دار ہو تو میاں بیوی کے درمیان تعلقات بہت اچھے رہتے ہیں۔

۴۔ بات بات پر میکے جانے والی بیوی: جب کبھی نااتفاقی ہوئی، والدین کے گھر چلی جاتی ہے، اس خواہش کے ساتھ کہ شوہر منا کر لے جائے۔ ایسے میں والدین حوصلہ افزائی کریں تو بیگم کے ساتھ شوہر کے لئے سسرال والے بھی دردسر ہو جاتے ہیں۔ یہ بچوں کا سا برتاؤ ہے۔ جذباتی طور پر بالغ ہونا ضروری ہے۔

عادات واطوار کے لحاظ سے مرد کی چند قسمیں یہ ہیں،

۱۔ خود پرست: خود پرست کا مطلب اپنی پرستش ہے۔ ایسے مرد چاہتے ہیں کہ بیوی ہر بات سے اتفاق کرے۔ ان کے نزدیک بیوی باورچی خانہ کی منتظمہ اور تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ جن لوگوں میں ان خصوصیات کی زیادتی ہوتی ہے وہ خود اپنے لئے معمہ بن جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

۲۔ زن پرست: اس قسم کے مرد مثالی ہوتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ عورت سے بحث نہیں کرنی چاہئے۔ وہ تنقید سے اجتناب اور چاپلوسی اور خوشامد کو مفید جانتے ہیں۔ زن پرست شوہر ہر مزاج کی عورت سے نباہ کر سکتا ہے۔ بیوی کو رفیقۂ حیات سمجھتا ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہو یا کام یاب — عورت اس قسم کے مرد کی عزت نہیں کرتی۔ حد سے زیادہ زن پرست مرد ذمہ داریوں سے گھبراتا ہے، بیوی کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ محبت کرنے میں کوڑھ مغز ہوتا ہے۔

۳۔ دل پھینک مرد: ایسی خواتین کی زندگی برباد اور اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت خوف میں رہتی ہیں کہ شوہر کسی اور کی طرف جھک کر انہیں چھوڑ نہ دے۔ ایسے مردوں سے احتیاط کرنی چاہئے، وہ کسی کے نہیں ہوتے۔

ایسے لوگوں کے لئے شاعر نے کہا ہے،

عورت کو سمجھتا تھا جو مردوں کا کھلونا
اس شخص کو داماد بھی ویسا ہی ملا ہے

۴۔ شکی مرد: شوہروں کی انتہائی خطرناک قسم ہے۔ یہ لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر شک کر کے بیوی کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے۔ گھر کے ماحول پر خوف طاری رہتا ہے۔ ازدواجی زندگی سکون سے عاری ہوتی ہے۔ دراصل یہ احساس

کم تری کا شکار مرد ہیں جو نفسیاتی حربوں سے احساس برتری چاہتے ہیں۔ اپنے جذبات کی تسکین کا خیال رکھتے ہیں مگر بیوی کے جذبات کا احساس نہیں ہوتا۔ بات بات پر بے عزتی کرتے ہیں۔ بیوی کو میکے کی اہم تقریبات میں شرکت سے روکتے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ شوہر کی بیوی پر اجارہ داری ہے۔ چاہتے ہیں کہ خوب منت وسماجت ہو۔

مرد اور خواتین دونوں کی نفسیات الگ ہے۔ دونوں توجہ چاہتے ہیں لیکن اپنے دائرہ سے نہیں نکلتے۔ دیکھا گیا ہے کہ مرد خواتین سے زیادہ صفائی پسند ہوتے ہیں۔ آفس سے آنے کے بعد گھر میں بے ترتیبی نظر آئے تو طبیعت پر بار پڑتا ہے۔ اسی طرح شوہر چاہتا ہے کہ بیگم صاف ستھرے لباس میں ہلکی پھلکی تیاری یا مسکراتے چہرہ کے ساتھ شوہر کا استقبال کرے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں دلہن ان باتوں کا خیال رکھتی ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ بالخصوص بچوں کے بعد وہ لاپرواہو جاتی ہے۔

اگر خواتین صفائی کا خیال رکھیں، اجلا لباس پہنیں تو یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ شوہر کی توجہ کم ہوگئی ہے۔ لہسن اور پیاز کا ذائقہ کھانے میں تو ٹھیک ہے لیکن کپڑوں میں سے ان کی بو آئے، اوپر سے روز نہایا نہ جائے خاص کر گرمیوں میں تو شوہر کے لئے پیاز اور لہسن کا ذائقہ کھانے میں بھی بے ذائقہ ہو جاتا ہے۔

خواتین معمولی خریداری کے لئے بھی جب گھر سے باہر جاتی ہیں تو لباس اور چہرہ کا خیال رکھتی ہیں۔ پھر شوہر کے معاملہ میں ان باتوں کو نظر انداز کیوں کر دیتی ہیں—؟ روز شام کے وقت ہلکی پھلکی تیاری میاں بیوی کے رشتہ کی خوب صورتی کو برقرار رکھتی ہے۔

مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔ جب شوہر گھر میں آتا ہے تو پہلا کام بیگم کا بچوں کی شکایت ہے۔ جب مرد بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے یا غصہ میں ہاتھ اٹھا دے تو بیوی بچوں کو کھینچ کر سینہ سے لگاتی ہے کہ اب بس کرو، کیا مار ہی دوگے—؟

سوال یہ ہے کہ شکایت کیوں لگائی—؟

سمجھانے کا کوئی اور طریقہ ہوسکتا تھا۔ ماں باپ بچوں کو پیار سے سمجھا سکتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ گھر آتے ہی شکایتیں لگانا شروع کر دیں اور پھر باپ سے پٹائی لگوا کے بچوں کو قریب کرنا—؟ بچوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ ماں میری ہم درد ہے اور باپ غصہ والا ہے۔

ماں کی ہر چند یہ کوشش ہوتی ہے کہ بچوں کے سامنے باپ ماں سے کم درجہ پر رہے۔ غصہ اس کا اپنا ہے جس کا اظہار وہ بچوں کو بنیاد بنا کرتی ہے لیکن پٹائی بچوں کی۔ اس رویہ سے ماحول خراب ہوتا ہے اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک گھر میں دو گروپ بن جاتے ہیں۔ ایک طرف باپ اور دوسری طرف ماں اور بچے۔ باپ اس تناؤ کو محسوس کرتا ہے اور پھر دل میں

بیوی کے لئے عزت نہیں رہتی — وہ دور ہو جاتا ہے۔

مضمون کا مقصد تنقید نہیں، اصلاح ہے۔ یہ رویے وقت کے ساتھ اتنے پختہ ہو جاتے ہیں کہ پھر بچے باپ کی عزت نہیں کرتے۔

دوسری طرف مرد کی نفسیات بھی عجیب ہے۔اس کا رویہ بچوں سے دوستی کا نہیں، رعب کا ہوتا ہے۔ رعب اچھی بات ہے کہ مگر اس طرح کہ باپ بچوں کا دوست بن کر رہے اور ادب بھی متاثر نہ ہو۔ اگر باپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی بچے ادھر ادھر ہو جائیں یا سہمے ہوئے بیٹھے ہوں تو یہ مرد کی برتری نہیں، باپ کی صورت میں ناکامی ہے۔ایسے میں جوان ہونے کے بعد بچے باپ کے اثر سے نکل جاتے ہیں اور جواب دینا شروع کر دیتے ہیں۔جس گھر میں باپ اور بچوں کے درمیان دوستی ہو اور گھر کا ماحول دوستانہ تو وہاں تعلقات مثالی ہوتے ہیں۔

ہر بچہ چاہتا ہے کہ باپ ماں کی عزت کرے اور ماں باپ کی۔مرد گھر سے باہر لوگوں سے خوش دلی سے ملتا ہے، بات بات پر قہقہے لگتے ہیں، خواتین کا احترام کرتا ہے مگر گھر پہنچ کر شخصیت کا دوسرا رخ سامنے آجاتا ہے۔ وہ خود کو کفیل سمجھنے کے بجائے حاکم سمجھتا ہے اور گھر کی فضا تلخ ہو جاتی ہے۔

شادی سے پہلے مرد آسمان سے ستارے توڑ کر لانے کی باتیں کرتا ہے لیکن شادی کے بعد گھر کی معمولی چیز لانے میں دقت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستارے تو میں اب بھی توڑ کر لے آؤں لیکن گرنے سے ڈر لگتا ہے۔

یہ سوال اہم ہے کہ جب مرد و خواتین میں دوستی یا منگنی کے بعد بات چیت ہوتی ہے تو دونوں اختلاف رائے کو برداشت کرتے ہیں، بالخصوص مرد بچھے جاتے ہیں، ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، رابطہ میں رہتے ہیں، تعریف کرتے ہیں، سراہتے ہیں، جو بات ناگوار گزرے نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن شادی کے بعد رویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

مردوں سے سوال ہے کہ جو ستارے شادی سے پہلے اتنے قریب نظر آتے تھے کہ انہیں توڑ کر لانا مشکل نہیں تھا، اب وہ دور کیسے ہو گئے — ؟ شادی کے بعد مرد کا رویہ کیوں تبدیل ہو جاتا ہے — ؟

جب خواتین کا اعتماد متاثر ہوتا ہے تو وہ ذہنی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔انہیں لگتا ہے کہ شوہر کی توجہ کم ہو کر کسی اور کی جانب مبذول ہو گئی ہے۔اب وہ وجہ تلاش کرتی ہیں اور سب کو شک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنانے کے اصولوں پر ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن اگر فرد بنیادی باتیں سمجھ لے تو چند اصول کافی ہیں۔

ا۔ ناخوش گوار اور تلخ گفتگو سے پرہیز کریں۔ بحث برائے بحث سے بحث شروع ہوتی ہے۔ بات اس وقت کریں جب صبر و ضبط کا دامن ہاتھ میں ہو ورنہ

خاموش رہیں اور نظر انداز کر دیں۔

۲۔مرد و عورت ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں اور ایثار کرنا سیکھیں۔رشتہ میں توازن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مزاج میں ٹھہراؤ ہو اور ٹھہراؤ ــــ ایثار سے آتا ہے۔

۳۔مرد کی ذمہ داری معاش اور عورت کی ذمہ داری تربیت ہے۔عورت نہ صرف بچوں کی، بلکہ اپنے رویہ سے مرد کی بھی تربیت کرتی ہے۔اور یہ اس وقت ممکن ہے جب اس کی اپنی شخصیت مضبوط ہو یعنی اس کی اپنی تربیت اچھی کی گئی ہو۔گھر اور معاشرہ عورت سے بنتا ہے کیوں کہ یہی عورت ماں کے روپ میں بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کی بھی تربیت کرتی ہے۔میاں بیوی یا ماں باپ دونوں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو رشتہ مضبوط، گھر خوش حال اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔

۴۔ہنسی مذاق کی عادت ہوتا کہ فضا خوش گوار رہے۔

۵۔ساتھ رہنے کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے لہٰذا دوسرے فریق کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔دونوں جنس کی مختلف خصوصیات ہیں البتہ تقاضے یکساں ہیں۔شوہر احترام چاہتا ہے تو بیوی بھی احترام چاہتی ہے۔

۶۔مرد و عورت کان کے کچے نہ ہوں۔

۷۔ایسے جوڑے جن کے تعلقات ناہموار ہوتے ہیں وہ ہر وقت لڑتے ہیں۔خامی کی صورت میں علاج کروائیں، بیش تر مسائل علاج سے حل ہو جاتے ہیں۔عموماً مرد حضرات علاج کے سلسلہ میں تعاون نہیں کرتے اور اسے توہین سمجھتے ہیں جو غلط سوچ ہے۔اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے ماہرین موجود ہیں۔

۸۔ازدواجی زندگی میں دونوں فریق برابر کے ذمہ دار ہیں۔اس میں تعاون کی ضرورت ہے نہ کہ ایک دوسرے پر برتری ظاہری کرنے کی۔کسی بھی شخص کو ہر معاملہ میں ہم خیال نہیں بنایا جا سکتا۔جہاں اختلاف ہے، اسے بھی رشتہ کی خوب صورتی سمجھئے۔

۹۔شکوے شکایات کم سے کم ہوں۔جانے انجانے میں ایسا فرد ہر وقت دوسروں کے عیب پر نظر رکھتا ہے اور غلطی کی تلاش میں رہتا ہے۔یاد رکھئے کہ رشتہ اور شخصیت کا حسن نظر انداز کرنے میں ہے۔

بی چیونٹی نے ہاتھی سے کہا، ہاتھی میاں! مساوات کا زمانہ ہے جتنا میں کھاتی ہوں، تم بھی اتنا کھایا کرو۔
ہاتھی بولا، بی چیونٹی تم ٹھیک کہتی ہو، مساوات کا زمانہ ہے، جتنا میں کھاتا ہوں، تم بھی اتنا کھایا کرو۔
سبق: ہر ایک کی طبیعت اور مزاج الگ ہے۔استحکام اور احترام اس میں ہے کہ جہاں ضروری ہو، رائے دیں مگر کسی کو پابند نہ کریں۔ہر رشتہ کو اتنی جگہ دیں کہ وہ آزادی سے سانس لے سکے اور اختلاف رائے کی گنجائش ہو۔

زاہدہ تبسم

یقین اور بے یقین

کام یابی و ناکامی شعور کی اختراع ہیں۔ دونوں پر نظر رکھنے سے الوژن (فریب نظر) پیدا ہوتا ہے۔ روحانیت کا سبق ایک ہے ــــ کوشش کرو اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔

تصور کیجئے کہ آپ صحرا میں تن تنہا موجود ہیں۔ نکلنے کا راستہ معلوم اور نہ یہ خبر کہ منزل یہاں سے کس طرف ہے۔ پانچوں اطراف ریت کے ٹیلوں کے سبب سمتوں کا تعین ممکن نہیں اور آسمان کی طرف دیکھیں تو وہ بھی سمتوں سے بے نیاز ہے۔ اس وقت ذہنی کیفیت کیا ہوگی ــــ؟

یقیناً انتشار ہوگا۔ کبھی ایک سمت میں تو کبھی دیوانہ وار دوسری طرف کا رخ کریں گے لیکن کسی بھی قدم میں یقین شامل نہیں ہوگا۔ کچھ دیر بعد ایک طرف مسلسل چلنے کا ارادہ کریں گے کہ شاید منزل کے آثار نظر آجائیں لیکن یہ چلنا بھی خوف اور وسوسوں پر مشتمل ہے۔ بالآخر تھک کر بیٹھ جائیں گے اور غیبی مدد کا انتظار کریں گے۔

مضمون میں صحرا ''زندگی'' اور شک ہونا ''طرز زندگی'' کو بیان کرنے کا ایک استعارہ ہے کہ ہمارا ذہن مرکوز نہیں ہے۔ سفر کے لئے منزل کا یقین اور یقین کے لئے ذہنی مرکزیت ضروری ہے۔

زندگی کے سفر میں راز کی بات یہ ہے کہ مسافر اپنے اندر متوجہ ہوجائے تو منزل کا سراغ مل جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مرکزیت کیا ہے ــــ؟

اندر متوجہ ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے ــــ؟

زندگی صحرا کی مانند ہے۔ جو صحرا کھلی اور بند آنکھوں سے نظر آتا ہے کیا کوئی اس کی سمتوں سے واقف ہے؟

جوابات کے لئے ''شعور'' کی اس دنیا میں سفر کرنا ہوگا جس سے ہم خود کو واقف سمجھتے ہیں۔

ہم محدود حواس میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے ذریعے سوچنے، سمجھنے اور حرکت کرنے کو عام طور پر ''شعور'' کا نام دیا جاتا ہے۔ سوچنا سمجھنا بذات خود ''حرکت'' ہے۔ حرکت کے پس پردہ توانائی ہے جس کا منبع لاشعور ہے۔ اسی سے شعور کو روشنی ملتی ہے۔

روشنی اطلاع ہے اور خیال کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ فرد ایک منٹ میں تقریباً چار سے چھ خیالات وصول کرتا ہے۔ خیالات کی تعداد سے توجہ میں تبدیلی

ظاہر ہوتی ہے۔ یک سوئی ہوتو خیال دیر تک قیام کرتا ہے۔اس کے برعکس ہجوم یہ ہے کہ ذہن ایک خیال کوکئی زاویوں سے سمجھے اور ترجمہ کرے۔

فرد اطلاع کی دوطرح تشریح کرتا ہے۔

۱۔ ایک رخ جس سے وہ مطمئن ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا رخ بے اطمینانی کی کیفیت ہے۔

تشریح کا انحصار معنی ومفہوم پہنانے سے ہے۔ ذاتی مفاد وابستہ نہ ہوتو سکون واطمینان ہے۔

صحت مند ذہن خوب صورت اور پاکیزہ خیالات کا مظہر ہے۔ مثبت خیالات کی مشق سے قوت بخش روشنیاں ذخیرہ ہوتی ہیں اور ذہن اور جسم تن درست رہتے ہیں۔خیال رکھئے کہ آپ کی اپنے بارے میں سوچ لوگوں کو منتقل ہوتی ہے اور پھر وہ اسی طرح پیش آتے ہیں اس لئے اچھے خیال کو خوش آمدید کہیں۔

صبح سے رات میں فرد عموماً دوطرح کے محسوسات میں سفر کرتا ہے۔ ایک ہمیں گوارا ہیں اور دوسرے ناگوار گزرتے ہیں۔مثلاً سردی گرمی، صحت و بیماری، شور اور سکون وغیرہ۔سردی کیا ہے اور گرمی کیا ہے—؟

جواب میں ہم نتیجہ بیان کرتے ہیں کہ درجۂ حرارت زیادہ ہوتو گرمی اور کم ہوتو سردی ہے۔لیکن درجۂ حرارت کیا ہے، اس پر غور نہیں کرتے۔کیوں ایک ہی شے کے بڑھنے اور کم ہونے سے موسم تبدیل ہوتا ہے؟ سردی کو گرمی کا متضاد رخ سمجھ کر بات ختم کردی جاتی ہے۔

''ماہنامہ قلندر شعور'' ستمبر 2018ء کے'' آج کی بات'' میں تحریر ہے:

''جہاں دو رخ ہوتے ہیں، پہچان مشکوک ہوجاتی ہے۔ جنت میں آدم وحوا جب تک شجر ممنوعہ سے دور رہے، شک سے محفوظ تھے۔ قریب گئے اور رنگ بدلتے دیکھا تو درخت کی پہچان مشکوک ہوگئی۔رنگ دیکھ کر ذہن سے درخت مغلوب ہوگیا۔ چوں کہ رنگوں میں تغیر ہے اس لئے رنگوں میں توجہ کی بنا پر نگاہ میں تغیر غالب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی زمین پر شے کو نہیں، رنگوں کو دیکھتا ہے۔رنگ تحلیل ہوتے ہیں تو شے غائب ہوجاتی ہے مگر غائب نہیں ہوتی۔''

رنگ آمیزش ہے، آمیزش سے شے خالص نہیں رہتی اور اصل مغلوب ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ باتوں سے خیال کو ہم آہنگ رکھا جائے تو لطافت اور پاکیزگی کے ماحول میں روشنیوں کا جسم توانا رہتا ہے۔اس کے برعکس عمل نقصان اور ناکامی ہے۔ناکامی سے فرد کو خیر پر یقین مشکل نظر آتا ہے کیوں کہ کامیابی کے امکانات نگاہ کے سامنے نہیں ہوتے جب کہ بے یقینی کے اسباب بھی موجود نہیں۔

کامیابی وناکامی شعور کی اختراع ہیں۔ دونوں پر نظر رکھنے سے الوژن (فریب نظر) پیدا ہوتا ہے۔ روحانیت کا سبق ایک ہے — کوشش کرو اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔

کیا کامیابی وناکامی کا خیال آنا حالات کو اپنے ذہن

سے دیکھنا نہیں ہے ــــ ؟ اگر ایسا ہے تو ذہن کا یہ دیکھنا خیال سے تصور اور تصور سے مظہر کیسے اور کیوں بنتا ہے، آیئے اس کا میکنزم سمجھتے ہیں۔

خیال میں تاثرات ہوتے ہیں مثلاً تصویری شکل، آواز، خوش بو یا لمس کی صورت میں۔ بعض اوقات جوش وخروش ہوتا ہے یا غم پریشانی بن جاتا ہے۔

سوال ہے کہ کیا تصور اور ارادہ کے ذریعے تاثرات تبدیل ہوتے ہیں ــــ ؟ جی ہاں ! ارادہ کے ذریعے تاثرات تبدیل ہوتے ہیں اور سب کو تجربہ ہے۔

مقرر تقریر سے پہلے تصور میں مشق کرتا ہے کہ وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ بہترین تقریر کر رہا ہے، اس طرح وہ خود کو مقصد سے قریب دیکھتا ہے۔

عظیمی صاحب نے طلبہ و طالبات کو یک سوئی کے لئے ''روحانی ڈاک'' میں ایک عمل تجویز کیا۔

''سب کاموں سے فارغ ہو کر جب آپ سونے کے لئے بستر پر لیٹیں تو چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور سامنے نظر جما کے خود کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ آپ کا چہرہ سامنے آ جائے تو بہت اچھا ہے ورنہ اپنا پورا نام لے کر یہ جملے تین بار دہرائیں۔

''اے ــــ (پورا نام) پڑھنے لکھنے میں تمہارا دل لگتا ہے۔ نہایت توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھتے ہو اور جو کچھ پڑھتے ہو اسے سمجھتے ہو یاد رکھتے ہو۔''

مرکزی اعصابی نظام تصورات کو علامات کے طور پر محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ اشارے یادداشت کے خلیوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور تحریک پیدا کرتے ہیں۔

مشق سے منفی سوچ تبدیل ہوتی ہے، یقین بڑھتا ہے اور ذہن منتشر ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

یک سو ذہن پرسکون ہوتا ہے اور سکون توازن ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ذہن اعتدال کے ساتھ توانائی کی مقداروں کو استعمال کر رہا ہے۔

سمجھنے کے لئے نیورو بیالوجی سے مدد لیتے ہیں۔

جس طرح یقین ایک اطلاع ہے، بے یقینی بھی اطلاع ہے جس میں شک ہے اور شک کثیف کرنٹ ہے۔ اس کرنٹ سے ذہن منتشر ہوتا ہے۔ انتشار نیورو transmitter کے عدم توازن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انتشار کو روکنے کے لئے میڈیکل سائنس کیمیائی عناصر (chemicals) کی مدد لیتی ہے جو خیالات کی آمد کو کم سے کم کر کے مریض کو وقتی سکون فراہم کرتے ہیں۔

یقین لطیف کرنٹ ہے۔ لطافت کے معنی یقین کی برقی رو میں تسلسل اور ہم آہنگی ہے۔ عصبی خلیوں کے درمیان روابط (synapses) طاقت ور اور مسلسل ہونے سے مزاحمت کم ہو جاتی ہے اور عصبی خلیوں کا مخصوص سرکٹ بنتا ہے جو فرد کو عمل پر آمادہ کرتا ہے۔

برگزیدہ ہستیوں کی تعلیمات راہ نما ہیں کہ کائنات یقین پر قائم ہے۔ اللہ کی مشیت کے تحت ہر شے حرکت

میں ہے۔مخلوق کو حرکت کا ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے تا کہ وہ اسے یقین کے حصول میں استعمال کرے۔

زیرِ زمین بیج سے نشوونما پانے والا پودا مخصوص مدت کے بعد زمین سے باہر نظر آتا ہے، اللہ نہ چاہے تو اسے وقت سے پہلے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ پودے کی جدوجہد وہ قوت ہے جو درخت بن جاتی ہے۔ یقین کے بغیر شے مظہر نہیں بنتی۔اور یہ اپنی کامیابی کا نہیں، اللہ کی رضا میں راضی رہنے کا یقین ہے۔

پانی سے پیاس بجھنے کا یقین سب کو ہے۔کسی بھی شے کو دیکھنا اور سمجھنا یقین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔یہی صورت غیب کی دنیا کی ہے۔اگر ہمیں غیب کا یقین نہ ہو تو ہم غیب کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتے۔

قانون: یقین کی تکمیل کے لئے مشاہدہ لازمی ہے۔

مثال: ایک شخص نے آسٹریلیا کا شہر سڈنی نہیں دیکھا لیکن اس کے بارے میں سنا ہے۔اسے یقین ہے کہ اس نام کا شہر موجود ہے۔جب وہ سڈنی جائے گا تو شہر کی تصویر حافظہ میں محفوظ ہو جائے گی۔واپس آ کر تصور میں جب چاہے، دیکھ سکتا ہے کیوں کہ تصور میں فاصلے ''حذف'' ہو جاتے ہیں۔اب سڈنی شہر اس کا یقین بن گیا۔

عظیمی صاحب یقین کے بارے میں فرماتے ہیں،

''یقین کہاں ہوتا ہے؟ جہاں بھی ہوتا ہے اسے انا، قوت انسانی (internal ego) کہتے ہیں۔انا یا

> تکلیف فرد کے اعمال کی وجہ سے آتی ہے
> اور وسعت برداشت کے مطابق ہوتی ہے کہ
> اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔
> ہر تکلیف رویوں میں بے اعتدالی کی نشان دہی ہے
> اور ہمیں کسی بڑی تکلیف سے بچانے کے لئے آتی ہے۔

ذات کی اصل خالق کائنات کی صفات ہیں جن کے ذریعے کائنات کے تمام افراد اور کائنات کے تمام افراد کے حواس ایک رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔''

افرادِ کائنات کو اللہ کی صفات سے زندگی مل رہی ہے۔ان صفات میں بے یقینی کا گزر نہیں ہے۔بے یقینی شیطانی وصف ہے۔شعور ایسی ڈیوائس ہے جو دو طرح سے توانائی حاصل کرتا ہے۔

۱۔ خارجی ماحول کی روشنیوں سے

۲۔ باطن کی روشنیوں سے

عالم ناسوت میں رہتے ہوئے مادی روشنیوں سے قطع تعلق ممکن نہیں لیکن اگر غیر مادی روشنیوں سے استفادہ کیا جائے تو سوچ میں یقین غالب ہو جاتا ہے۔

نوع آدم کے شعور میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کے یقین کو نمایاں کرنا انبیائے کرام کا مشن ہے۔قرآن کریم کے مطابق شک گمان ہے۔شیطان کا واحد ہتھیار بے یقینی ہے۔دانش ور اور محقق مفروضہ کے بجائے شے کے محرک سے واقف ہونے کی کوشش کریں تو ''یقین'' میں داخل ہو جائیں گے۔

اقتباسات

’’ماہنامہ قلندر شعور‘‘ کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

یہ بات روزمرہ مشاہدہ میں آتی ہے کہ ہماری نظر ایک متعین حد میں کام کرتی ہے لیکن اگر نظر کی متعین حدود میں اضافہ کر دیا جائے تو نظر عام حالت میں جتنا دیکھتی ہے اس سے زیادہ فاصلہ پر دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً ہم آنکھوں پر دوربین لگاتے ہیں۔ دوربین کے اندر جو شیشے (lenses) لگے ہوتے ہیں وہ اس طول موج کو، جو نظر کے لئے دیکھنے کا باعث بنتی ہے، آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ اب ہم میلوں فاصلہ کی چیز دیکھ لیتے ہیں۔ کسی آدمی کی نظر کم زور ہے۔ سامنے کی چیز اسے نظر نہیں آتی۔ اور چشمہ لگانے کے بعد وہ دور تک دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیشہ کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اگر آپ اس کو صیقل کر لیں، اس کی طاقت بڑھا دیں تو نظر دور تک کام کرنے لگتی ہے۔ جب آپ شیشہ کے اندر سے میلوں دیکھ رہے ہیں تو اس آنکھ سے جس آنکھ نے فرشتوں کو دیکھا ہے، اور اللہ کو دیکھا ہے، غیب کی دنیا میں کیوں نہیں دیکھ سکتے — ؟ یہ نہ سمجھا جائے کہ آدم کوئی ایسی چیز ہے اس کے اندر مخصوص صلاحیتیں کام کرتی ہیں اور آدم کی اولاد کوئی ایسی چیز ہے جس میں وہ صلاحیتیں کام نہیں کرتیں۔

(مرسلہ: وہاب، کراچی۔ کتاب: قلندر شعور)

ہم شعوری طور پر مانتے ہیں کہ آکسیجن پر زندگی کا دارومدار ہے۔ یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی۔ عقل راہ نمائی کرتی ہے کہ ایک گھر میں چھ آدمی ہیں اور یہ چھ آدمی آکسیجن کے اوپر زندہ ہیں — لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اگر ہم گھر کو غبارا سمجھ لیں اور اس غبارے کے اندر کلیتاً آکسیجن کا عمل دخل مان لیں تو یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ غبارے میں آکسیجن موجود ہے۔ غبارے میں آکسیجن موجود ہونے کے باوجود پانچ

آدمی زندہ رہتے ہیں اور ایک آدمی مرجاتا ہے۔ اگر زندگی کا دارومدار آکسیجن پر ہے تو آکسیجن ایک آدمی کے لئے کیوں زندگی کا سہارا نہیں بن رہی—؟ باقی پانچ آدمی آکسیجن سے کیوں مستفید ہو رہے ہیں—؟ اور آکسیجن کے ذریعے مرنے والے فرد کو کیوں زندہ نہیں کرلیا جاتا—؟

(مرسلہ: نوشین، حیدرآباد۔ کتاب: وقت)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ بدگمانی غیبت کی ایک شاخ ہے، اسے غیبت قلب کہتے ہیں۔ بدگمانی سے مراد کسی کے متعلق وہ خیال کرنا جو حقیقی نہ ہو۔ یہ ایک وہم ہے جو جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے، کسی کی طرف انہونی بات منسوب کرنا۔ برا آدمی کسی کے متعلق اچھا گمان نہیں رکھتا۔ اسے کسی کے کام میں حسن نیت نظر نہیں آتا۔ ہر چیز کو بے یقینی سے دیکھنا، اس کے اندر کیڑے نکالنا بدگمانی کا نتیجہ ہے۔

بدگمانی تمام فوائد زندگی کے لئے زہر قاتل ہے۔ بدگمانی اور پھوٹ آپس میں بے اعتباری، بدظنی، بے یقینی، بددیانتی اور نااتفاقی کا سبب ہے۔ بدگمانی سے دوسروں کے متعلق کینہ اور حسد پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ عداوت ہوتا ہے۔ جس گھر، قبیلہ اور قوم میں بدگمانی ہوگی وہاں نااتفاقی، ذلت، غم خواری، مفلسی، محتاجی، تنگ دستی مسلط ہوجاتی ہے۔ بدگمانی کی کیفیت میں زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ بدگمانی کے ماحول میں فرد کام سے جی چرانے لگتا ہے اور آپس میں بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔

(مرسلہ: شکیلہ بیگم، گوجرانوالہ)

عقل و دانش کا وسیلہ قدرت ہے جس نے انسان کو دانش کے استعمال کی صلاحیت عطا کی ہے۔ قدرت کے قوانین میں پنہاں لامحدود حکمت اذہان (ذہن کی جمع) کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی قیادت کے زیر اثر انسان فہم و فراست کی دل کش تاریخ بناتا چلا جارہا ہے۔ قدرت انسان کو اپنے قواعد و ضوابط کے ادراک کی ہمیشہ ترغیب دیتی آئی ہے۔ یہ ترغیب انسانی ذہن میں تجسس اور تحقیق کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ تجسس و تحقیق احساسات ہیں جنہوں نے انسانیت میں بے پناہ ہمت و اہمیت پیدا کی ہے، تمام تر ترقی و خوش حالی اسی اہمیت و اہلیت کا نتیجہ ہے۔ انسان جب جبلت کی سطحوں سے نکل کر فطرت کے اصولوں کے مطابق سوچتا ہے تو قدرت اسے معرفت و عرفان کی اس سطح پر لے جاتی ہے جہاں انسان کو کائنات میں جاری و ساری قوتوں کی حقیقی پہچان ہوجاتی ہے۔ اسی پہچان کے بل بوتے پر انسان کو ذات و صفات کا عرفان ہوتا ہے۔ (مرسلہ: خبیب شاہد، کراچی)

زینب صدیق

محمود سامی البارودی

’’ذہن میں تصورات سے بھرپور ایک جھماکا ہوتا ہے، جس کی شعاعیں دل تک پہنچتی ہیں اور روشنی سے لبریز ہوکر زبان کی نوک تک آتی ہیں۔ پھر زبان ہر طرح کی حکمت و دانائی کا اظہار کرتی ہے جس سے اندھیرا دور ہوتا ہے اور مسافر کا راستہ بنتا جاتا ہے۔‘‘

غم والم میں ڈوبا ہوا، بے خوابی کا شکار
نرم وسرد جذبوں سے بے غرض ہوگیا ہوں
کہ نہ تو رات کی تاریکی ختم ہوتی ہے
نہ روشن سحر کی امید ہے
شکایتوں کو سننے والا کوئی ساتھی بھی نہیں
کوئی خبر آتی ہے، نہ کوئی ہیولیٰ پاس سے گزرتا ہے
میں یہاں دیواروں کے درمیان، حفاظت سے بند
کئے گئے دروازہ کے پیچھے پڑا ہوا ہوں
یہ دروازہ اس وقت چرچراتا ہے جب داروغہ اسے
کھولنے آتا ہے،
باہر راہ داری میں اس کے ٹہلنے کی آواز سنتا ہوں
لیکن جیسے ہی چار دیواری کے اندر اس خلا میں میری ہلکی
سی آواز بھی نکلتی ہے، داروغہ کے قدم رک جاتے ہیں
جب میں کسی کام کے لئے دائیں بائیں مڑتا ہوں
تو تاریکی مجھ سے کہتی ہے کہ رک جاؤ، حرکت مت کرو
تاریکی میں مطلوبہ شے کی تلاش میں راستہ ٹٹولتا ہوں
لیکن جس کی تلاش ہے، وہ ملتی نہیں
اور نہ میری روح کو اطمینان ہوتا ہے
کسی روشن ستارہ کے بغیر اس کمرے کی تاریکی
میری سانسوں میں پیدا ہونے والی آگ سے ٹوٹتی ہے
اس لئے اے میری روح! تحمل سے کام لے
جب تک تیرا مقصود حاصل نہ ہوجائے
کہ صبر وتحمل ہی کامیابی کی کنجی ہے
ہماری حیثیت وہ سانسیں ہیں جو ہم نے خرچ کی ہیں
کہ آدمی جہاں کہیں ہے، قسمت کا قیدی ہے!

یہ اٹھارویں صدی میں پیدا ہونے والے مصر کے معروف انقلابی شاعر محمود سامی البارودی کی ایک نظم کا ترجمہ ہے جو اس نے اسیری کے دوران لکھی اور قید تنہائی کو جھنجھوڑنے والے الفاظ میں بیان کیا۔

محمود سامی البارودی نے ہوش سنبھالا تو مصر، فرانسیسی افواج کے زیر تسلط تھا۔ 1805ء میں محمد علی پاشا کے برسر اقتدار آتے ہی مصری طرز معاشرت، تہذیب و تمدن اور سماجی رسم ورواج میں تبدیلی رونما ہوئی۔ جدید

انداز فکر پر مبنی تعلیم، تربیت اور شعر و ادب کا ماحول پیدا ہوا۔ عربی شاعری روایتی موضوعات سے نکل کر منطق و فلسفہ اور زندگی کے پیچیدہ مسائل سے ہم آہنگ ہوئی۔

محمود سامی البارودی کے آباؤ اجداد کا تعلق شمالی مصر کے ایک شہر ایتائی البارود سے تھا جو فوج کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ البارودی 1839ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ بعد ازاں ملٹری اسکول میں داخلہ لیا۔ 1855ء میں بطور آرمی افسر وہ قسطنطنیہ پہنچا جہاں وزارت خارجہ میں تعیناتی ہوئی۔ اس دوران ترکی اور فارسی زبان میں مہارت حاصل کی۔

ادبی ذوق کے سبب محمود سامی البارودی نے عربی ادب کے مایہ ناز شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ سے تخلیقی قوتیں بیدار ہوئیں اور وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو گیا۔ حافظہ تیز ہونے کے سبب معروف شعرا کا کلام یاد ہو گیا۔ پسندیدہ اشعار کا مجموعہ مرتب کیا۔ کلام کا انتخاب اس کی باریک بینی، ادبی ذوق کی بلندی، فکر و خیال کی ندرت، مزاج کی رعنائی اور نظریات کی جدت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ،

''میری شاعری ظاہر میں اور، باطن میں اور نہیں۔ نہ ہی میں اس سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی امید رکھتا ہوں، میں انجانی تحریک کے تحت لکھتا ہوں، جس میں وسعت نظر اور محبت کی تپش ہے جو میرے دل میں بہتی ہے اور مجھے تحریک دیتی ہے کہ شاعری کے ذریعے آواز بلند کروں اور روح کی دل جوئی کر سکوں۔''

بالفاظ دیگر وہ کہنا چاہتا ہے کہ شاعر کو صرف اندرونی خواہش کی اطاعت میں لکھنا چاہئے نا کہ دنیوی فوائد کے حصول کی غرض سے۔

بارودی کو اپنے نظریات کے سبب صعوبت سے دو چار ہونا پڑا تاہم اس کے خیالات تبدیل نہیں ہوئے۔ عرابی بغاوت میں شمولیت کے سبب بارودی پر مقدمہ چلا اور پھر حکم ران توفیق نسیم پاشا نے اسے سیلون (Ceylon) جلاوطن کر دیا جہاں اس نے سترہ سال گزارے۔ جلاوطنی کے دوران کس مپرسی کے سبب بیٹی اور بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس غم میں بینائی بہت حد تک متاثر ہوئی۔ اہلیہ کے غم کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ ترجمہ:

اب جب کہ تم جا چکی ہو
میرا دل کبھی غم سے خالی نہیں ہوگا
اور نہ میرا بستر نرم ہوگا
جاگتا ہوں تو پہلا خیال تمہارا ہوتا ہے
سوتا ہوں تو تمہاری یاد میری آخری پناہ گاہ ہے

بارودی کی شاعری میں شخصیت کی بے باکی نمایاں ہے۔ اپنے وقت کے نظام پر نکتہ چینی کی اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند رکھی۔ وہ کہتا ہے،

سب سے زیادہ مہلک بیماری جو آنکھ دیکھتی ہے
وہ جابر کی ظلم و زیادتی ہے

جب کہ عوامی اجتماعات میں
اس کی تعریفوں کے گن گائے جاتے ہیں۔
وہ جبر وظلم کے محرکات، حق اور انصاف کی راہ میں حائل رکاوٹوں پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ ترجمہ:
''موت سے خائف شخص کے لئے دنیا کی زندگی ذلت ہے۔ ذلت وخواری کی زندگی سے موت بہتر ہے۔''
اس کی نظمیں ان جنگوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں جن میں وہ شریک ہوا۔ طویل سفر کے دوران جن مقامات کی سیاحت کی، وہاں کے مناظر کی بھی منظر کشی کی ہے۔ بہت سی نظموں میں زندگی کے نشیب وفراز کا ذکر ہے، اور یہ بتاتی ہیں کہ اس کی طاقت واقتدار کس طرح شکست وریخت میں تبدیل ہوگئے۔
بارودی کی زیادہ تر شاعری جلاوطنی کے مصائب، گھر کی یاد اور مصر کے ان مقامات اور مناظر سے متاثر ہے جنہیں وہ دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔
دریائے نیل کے بارے میں وہ لکھتا ہے،
''نیل گائے کی طرح دیکھتا ہے، شاخ کی طرح بل کھاتا ہوا چلتا ہے اور ماہ کامل کی طرح مسکراتا ہے۔''
بارودی نے شب کی سیاہی، بجلی کی گرج چمک، ہوا کے تند وتیز جھونکے، بادصبا کی اٹکھیلیاں، ریگ زار کی چاندنی، بارش کی مترنم آواز اور فلک کے رنگ، صبح وشام کے کیف پرور ماحول کی خوب صورتی سے منظر کشی کی ہے۔ ترجمہ:
'' تاریک بھیگی رات میں بجلی تلوار کی طرح کوندی ہے۔ بدلی نے اپنی چادر میں اسے پوری طرح لپیٹ لیا ہے اور اس کے دونوں کناروں پر تیز اور موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔''
کلام میں کہیں ہنگامہ خیز اور طوفانی راتوں کا ذکر ہے تو کہیں ستاروں سے بھرے آسمان، شور وغوغا مچاتے سمندر، پہاڑوں اور جنگلات کی تصویر کشی ہے۔
بہار کے موسم اور مصر کے دیہی علاقوں کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ،
''بارش کا زمانہ آیا، نالیاں بہنے لگیں، تالاب اور چشمے ابل پڑے۔ درخت کلیوں سے آراستہ ہوگئے اور ان کی شاخ پر بلبل گانے لگی۔ ہر طرف خیر وبرکت کے آثار نمایاں ہیں۔ روئے زمین پر ہریالی ہی ہریالی ہے۔''

بارودی کے کلام میں جہاں زندگی کے تلخ تجربات اور گہرے مطالعہ کا دخل ہے، وہیں اس کی شاعرانہ فطرت اور خاندان کے بھی عربی ادب پر احسانات ہیں۔ اس کے ماموں ابراہیم عربی ادب میں معروف تھے۔
محمود سامی البارودی نے لکھا ہے،
'' شاعری ہمارے خاندان کا قدیم سرمایہ ہے۔ میں اپنے خاندان کا تنہا شاعر نہیں ہوں۔ میرے ماموں ابراہیم اس میدان میں عظیم شہرت کے مالک تھے۔''
تخلیقی صلاحیت اور اشعار کے ورود پر اس نے کہا،
''میں آمد پر شعر کہتا ہوں۔ نہ کسی کی تقلید کی ضرورت ہے اور نہ بے تکلف شعر گوئی کی خواہش۔ جب طبیعت

میں جوش پیدا ہوتا ہے تو زبان سے اشعار کے موتی جھڑنے لگتے ہیں، یہ تعجب کی بات نہیں کیوں کہ موتی دریا میں ہی پیدا ہوتا ہے۔''

بارودی نے رومان کو بھی فکری انداز میں پیش کیا۔ وہ عشق و محبت، زلف و رعنائی، حسن و جمال، ہجر و وصال اور دیدار محبوب کے ساتھ بنت حوّا کے سیمیں پیکر پر بھی گوہر افشانی کرتا ہے۔

صنف نازک سے متعلق ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے:

''رخسار گلاب کی مانند، پیشانی بنفشہ جیسی، قدّ ٹہنی کی مانند اور نگاہ ہرنیوں کی طرح ہے۔''

محبوب کی یاد کو اس طرح بیان کیا ہے،

''حالت سرور میں یاد ماضی نے مدہوش کر دیا ہے۔ پھر مجھے تنبیہ و ملامت کی پروا نہیں ہوتی۔ میں ایسے مدہوش کی مانند ہوں جسے پرانی قیمتی شراب پلا دی گئی ہو۔''

بارودی کی نگاہ میں شاعری کا مقصد یہ ہے،

۱۔ حیات انسانی کو مہذب بنانا

۲۔ فہم و ذہن کو مشاق بنانا

۳۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی جانب دلوں کو مائل کرنا۔

بارودی نے جنگوں میں بھی حصہ لیا لیکن شمشیر سے وہ کارنامہ انجام نہیں دیا جو قرطاس و قلم سے انجام دیا۔

تقریباً پچاس سالہ ادبی زندگی میں ایک نئے اسکول، نئے مکتبہ فکر، نئے زاویہ نگاہ اور نئے انداز فکر کی بنیاد رکھی۔ جلاوطنی کے دوران اس نے تیس مایہ ناز شعرا کا کلام ''مختارات البارودی'' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اپنی موت سے چار سال قبل 1900ء میں اسے مصر واپس آنے کی اجازت ملی، اس حال میں کہ اعصاب مضمحل اور ہمت ماند تھی۔

محمود سامی البارودی کا دیوان اس کی موت کے بعد 1915ء میں سامنے آیا۔ دیوان کا پیش لفظ ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ،

''ذہن میں تصورات سے بھرپور ایک جھما کا ہوتا ہے، جس کی شعاعیں دل تک پہنچتی ہیں اور روشنی سے لبریز ہو کر زبان کی نوک تک آتی ہیں۔ پھر زبان ہر طرح کی حکمت و دانائی کا اظہار کرتی ہے جس سے اندھیرا دور ہوتا ہے اور مسافر کا راستہ بنتا جاتا ہے۔''

دیوان کے پیش لفظ میں وہ قاری کو اخلاص، سچائی، فطرت اور برجستگی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس میں الفاظ ہم آہنگ اور خیالات روشن ہوں، جو بناوٹ سے عاری، واضح اور گہرا ہو۔ باردوی کا کہنا ہے کہ بہترین شعر وہ ہے کہ جب زبان سے ادا ہو تو لوگ بے ساختہ کہیں کہ جو کہا — سچ ہے۔

اپنی شاعری کے بارے میں وہ کہتا ہے،

''میری باتیں دیکھو! اس میں تمہیں میری روح نظر آئے گی۔''

مرشد کی باتیں (۲)

مرشد کریم سے عرض کیا، خیال — خواب اور بیداری دونوں میں آتا ہے اور جس ذریعہ سے ہم تک پہنچتا ہے ہم اس کو آواز کہتے ہیں۔ زیادہ تر یہ آواز بے آواز ہوتی ہے لیکن ہوتی آواز ہے۔ خیال اور آواز کو کیسے سمجھیں—؟

فرمایا، جو کچھ بتا رہا ہوں، اسے لکھ لو اور پھر ایک سے زیادہ مرتبہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھو اور جو سمجھ میں آئے، لکھ لو۔ تفکر سے شرح صدر ہوگا اور تخلیق کے نظام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

قلم اور کاپی پاس تھے۔ لکھنا شروع کیا،

صاحب علم لدنّی نے فرمایا— خیال کیا ہے، کہاں سے آتا ہے، اس کے اوپر الوژن کا پردہ ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی بیداری میں الوژن کی دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ سب خواب میں دیکھتا ہے۔ نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ متاثر بھی ہوتا ہے۔ سانس کی آمد و شد کے ساتھ آدمی بستر پر لیٹا ہے لیکن زندگی کی تعریف پوری نہیں ہوتی۔ ہم جس عمل کو نیند کہتے ہیں وہ موت سے ملتی جلتی حالت ہے۔ غور کرو کہ زندگی کیا ہے—؟ کھانا پینا اور دیگر ضروریات پوری کرنا اگر بیدار زندگی ہے تو یہ سب عمل تقریباً ڈیڈ باڈی کی حالت یعنی سونے اور بیداری میں یکساں ہے۔ مذہب بیداری کے بعد غسل واجب قرار دیتا ہے، فزیکل باڈی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پھر خواب کی دنیا بیداری سے الگ کیسے ہوگئی اور ہم خواب کس کو کہہ رہے ہیں—؟

عرض کیا، وہاں نتائج سامنے نہیں آتے، یہاں نتیجہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

فرمایا، نتیجہ تو غسل واجب ہونے سے وہاں بھی ظاہر ہو گیا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نسل آگے نہیں بڑھتی تو اس سے فرق نہیں پڑتا، ہر عالم کا اپنا نظام ہے۔

عرض کیا، اس کا مطلب خواب حقیقت میں کیا ہے، ہم واقف نہیں۔

فرمایا، ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بیداری کیا ہے۔ یہاں بھی اسپیس اور وہاں بھی اسپیس ہے۔ ایک میں فرد اسپیس کے تابع ہے اور ایک میں اسپیس فرد کے تابع ہے لیکن دونوں میں زندگی خیال کی پابند ہے۔

سمجھو— ایک غبارا ہے۔ غبارا شعور نے بنایا ہے، ڈائی میں تصویروں کے نشان دیئے، ہوا بھری— پرندہ نمایاں ہو گیا۔ کس وقت نمایاں ہوا—؟ جب اس میں پھونک بھری گئی۔ مطلب کوئی جگہ ایسی ہے جہاں نقش و

نگار موجود لیکن ظاہر نہیں ہیں۔ نقش و نگار کو ٹائم کا بھی نہیں پتہ، نہ اسپیس کی خبر ہے۔ اہم کیا ہے — ؟ ٹائم۔ اب ٹائم کے درمیان اسپیس آتی ہے۔ اسپیس کا مطلب دو چیزوں کے درمیان فاصلہ چاہے وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو — یہ فاصلہ اسپیس ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو جان اپنے خیال میں یک جان ہو جاتی ہیں لیکن کتنی ہی قربت ہو جائے، ذہن میں دو کا ہندسہ غالب رہتا ہے۔ اتنا لکھوا کر وہ تھوڑی دیر رکے۔

عرض کیا، اگر دو کا ہندسہ ذہن سے نکل جائے پھر؟

فرمایا، دونوں ختم ہو جائیں گے۔

ذہن میں سوال تھا کہ اگر دو کا ہندسہ موجود رہے گا تو پھر قربت کیسے ہوگی — ؟ مگر وہ خاموش، تحریر کو بغور دیکھتا رہا۔

مرشد کریم نے تھوڑی دیر بعد فرمایا، بات کو مثال سے سمجھو۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ہے۔ ایک ماں ہوئی اور ایک بچہ۔ ماں امید سے ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ کیا مطلب ہوا اس کا — ؟

عرض کیا، مطلب یہ ہے کہ ماں نہیں سوچتی کہ یہ بچہ میں ہی ہوں۔ جب اس کے وجود کا ایک حصہ یا صفت اس سے بظاہر الگ ہوئی تو درمیان میں اسپیس کی وجہ سے ماں نے بچہ کو خود سے الگ سمجھا۔

فرمایا، جب کہ بچہ کو سب کچھ ماں سے مل رہا ہے۔ اب غور سے سنو! ہر جان کا وجود یا پیدائش دو رخوں پر ہے۔ قانون یہ ہوا کہ جب تک کسی وجود کے دو وجود نہیں ہوں گے، مظاہرہ نہیں ہوگا۔

وہ لکھتے لکھتے رک گیا اور بے ساختہ انہیں دیکھا۔

عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ کسی وجود کے دو وجود۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وجود کے جو دو وجود ہیں، دونوں الوژن ہیں — ؟

فرمایا، ابھی اس طرف مت جاؤ ورنہ الجھ جاؤ گے۔ جو سمجھانا چاہ رہا ہوں، اس پر ذہن مرکوز رکھو۔

اثبات میں سر ہلا کر ایک بار پھر لکھنے کے ساتھ ساتھ ذہن کو ان کی آواز پر یک سو کر دیا۔ رموز اس وقت کھلتے ہیں جب وہ خود کو ان کی آواز پر یک سو کر دیتا ہے اور پھر ذہن میں جھماکے ہوتے ہیں۔

فرمایا، اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق قادر مطلق ہیں — دو رخ متعین ہوئے۔

۱۔ ایک خالق

۲۔ ایک خالق کا چاہنا یعنی ارادہ کرنا۔

ارادہ کا ظہور قدرت کے چاہنے کے مطابق ابعاد (dimension) کے ساتھ چیز کا ظاہر ہونا ہے۔ ایک بار پھر سمجھو! دو رخ متعین ہوئے۔ ایک رخ اللہ کا چاہنا ہے۔ اللہ کا چاہنا دو رخ پر قائم ہے۔ اللہ نے ایک رخ اپنا رکھا اور دوسرا رخ اللہ کی صفات کا مظاہرہ ہے اور صفات کا مظاہرہ تخلیقات ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان تخلیقات کو ظاہر فرمایا تو حکم دیا کہ تخلیقات کا مظاہرہ ہو! اور مخلوقات کا وجود ظاہر ہو گیا۔ آدم دو رخوں سے مرکب ہے۔ دونوں رخ الگ

ہونے کے باوجود، دونوں ایک دوسرے کی کشش میں مصروف ہیں۔

مرشد کریم نے فرمایا، تخلیق جو کچھ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ مخلوق اپنا تعارف چاہتی ہے۔ ذہن میں تجسس بولتا رہتا ہے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، کہاں سے آیا ہوں۔

نہ میں آبی نہ میں خاکی
نہ میں آتش نہ میں پون
بلھا کیہ جاناں میں کون
بلھا کیہ جاناں میں کون

کلام پڑھتے وقت ان کی آواز میں ٹھہراؤ اور گہرائی ناقابل بیان ہے۔ دل پر ضرب محسوس ہوئی۔

فرمایا، رحیم و کریم اللہ خود کو متعارف کرنے کے لئے فرماتے ہیں، الست بربکم — میں تمہارا رب ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان آواز بن کر کانوں سے ٹکراتا ہے تو سماعت متحرک ہوتی ہے۔ سماعت سے واقف ہونے کے بعد تجسس ہوتا ہے کہ یہ آواز کس کی ہے۔

فرمایا، ٹھیک ہے اب لکھو — تفکر گہرا ہوتا ہے تو آنکھوں میں نور اترتا ہے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کا دیدار ہوتا ہے۔ وجود کا ایک رخ سماعت، لہروں سے تفکر کا دروازہ کھولتا ہے اور بصارت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ بندہ چشم پرخمار سے خالق کائنات اللہ کا دیدار کرتا ہے۔ دیدار میں کششِ قریب سے بندہ اللہ کو دیکھتا ہے اور اظہار بندگی کے لئے قالوا بلیٰ کہہ کر اور پیشانی زمین پر رکھ کر خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

اتنا لکھوا کر فرمایا، غور کرو — وضاحت ہوگئی۔

بعض اوقات مرشد کریم جب کوئی تحریر لکھواتے ہیں تو ماحول بدل جاتا ہے۔ ان کی آواز سن کر آنکھوں کے درمیان تھوڑا اوپر لطیفہ خفی کے مقام پر دباؤ محسوس ہوتا ہے۔ دراصل یہ تحریر نہیں، ان قوانین کا بیان ہوتا ہے جن پر وہ بہت کم اس انداز میں بات کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کہیں اور دیکھ کر یہاں لکھوا رہے ہیں۔ یعنی یہاں موجود ہو کر بھی موجود نہیں جب کہ بظاہر غیر موجود ہو کر بھی موجود ہیں۔ یہ ایسا رمز ہے جو سننے والے پر نہیں کھلتا۔ ایسے میں وہ خاموشی سے لکھتا رہتا ہے تاکہ تسلسل متاثر نہ ہو کیوں

کہ یہ تحریر لاشعوری ہے ــــ اور لکھوانے والا یہاں وہاں عالمین میں موجود ہے۔

اور جب ان کے سمجھانے کا انداز سوال جواب والا ہو، مرید اس وقت بات کرتا ہے۔ لکھوانے کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ آپ کیا سمجھے ــــ؟

مرشد اور مرید کے رشتہ میں یہ بات بہت خوب صورت ہے کہ مرید جیسا بھی ہے، مرشد کے سامنے ہے اور مرشد یہ جانتے ہوئے بعض اوقات انجان بن جاتے ہیں۔ وجہ پانچ سال بعد سمجھ میں آئی۔ بیان کرنے کا فائدہ نہیں کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جب تک بندہ خود نہیں گزرتا، پڑھ کر بھی نہیں کھلتیں۔

شیخ طریقت کی قربت میں اس نے سیکھا ہے کہ بندہ اگر اس بات سے بے نیاز ہو جائے کہ لوگ اسے اچھا یا برا سمجھیں تو دوسروں کے بارے میں سوچنے سے ذہن پر جو بار پڑتا ہے، وہ نہیں پڑتا۔ لوگوں سے بے نیاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ خود غرض ہو جائے، بس ''ضمیر'' کے خلاف کوئی کام نہ ہو۔

سوچ رہا تھا کہ ہم ساری زندگی خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس وجہ سے کبھی احساس کم تری کا شکار ہوتے ہیں اور کبھی برتری کا۔ لوگوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے یہ سوچنا چاہئے کہ میں اللہ اور اس کے محبوبؐ کی نظر میں کہاں ہوں۔ یہ ایسا عمل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پورے ہوتے ہیں۔

شیخ نے خیال کو خیال در خیال کھول کر جو رموز بیان فرمائے، ذہن ان پر مرکوز کر دیا۔ سوچا کیا بات ہے کہ شیخ طریقت الست بربکم کے واقعہ کو لکھواتے ہوئے ہمیشہ جس انداز میں بیان کرتے ہیں، دل کہتا ہے کہ اس میں پنہاں رمز ابھی منکشف نہیں ہوا اس لئے بار بار متوجہ کر رہے ہیں۔ وہ رمز تو کھولتے ہیں لیکن پردہ میں رہ کر ــــ اس طرح کہ پردہ اٹھ کر بھی پردہ رہتا ہے۔

الست بربکم سے متعلق سوال ان سے پوچھنا چاہتا تھا، مگر پوچھا نہیں کہ یہ وقت ان کے آرام کا تھا۔ خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ بات طویل ہو جائے۔ مرشد کریم، علم دوست ہستی ہیں اور اپنے آرام کو نظر انداز کر کے چاہیں گے کہ مرید کی تشفی ہو ــــ لیکن مرید کو مرشد محبوب ہے۔ جس لمحہ خیال آتا ہے کہ ان کو تھکن ہو گئی ہے، لمحہ کی تاخیر کے بغیر کاغذ قلم رکھ دیتا ہے۔

شیخ طریقت علمی سوال پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کا ذہن مسائل سے ہٹ کر تفکر کی جانب مائل ہو۔ تفکر کرنے والے کی زندگی دائرہ میں آتی ہے ــــ مسائل میں الجھا شخص مثلث میں رہتا ہے مثلث میں ہر موڑ پر رکاوٹ ہے جب کہ دائرہ میں روانی ہے۔ ذہن مسائل پر نہیں رکتا، اور خوشی غم دونوں آ کر گزر جاتے ہیں۔ ورنہ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ــــ یہ کیا نہیں، یہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، یہ رہا نہیں!

مؤلف: نعیم قریشی

شطرنج کے موجد کا انعام

ایک بادشاہ، ایک وزیر، دو فیل، دو گھوڑے، دو رُخ اور آٹھ پیادے

روایت ہے کہ ایک بار ایران کا شہزادہ، عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آیا اور دونوں میں شطرنج کھیلنے کا مقابلہ ہوا، اس شرط کے ساتھ کہ جو شکست کھائے گا اسے محل کی ایک بیگم جیتنے والے کو دینا ہوگی۔

اتفاق سے کھیل کا ایسا نقشہ پیدا ہوا کہ شاہ جہاں کا مات کھانا یقینی تھا۔ پریشانی میں کھیل چھوڑ کر محل میں گیا غالباً یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کس بیگم کو نذر کیا جائے۔

پہلے وہ جہاں بیگم کے پاس گیا اور سارا قصہ سنایا۔

جہاں بیگم نے کہا کہ میرے جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور عذر پیش کیا کہ،

تو بادشاہِ جہانی، جہاں زدست مدہ
کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

یعنی بادشاہ کا وجود ہی منحصر ہے جہاں پر، اس لئے آپ اسے کیوں کر دے سکتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ جہاں، حیات بیگم کے پاس گیا اور اس نے بھی بڑا معقول عذر پیش کیا کہ،

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید
اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

یعنی جب حیات (زندگی) ہی باقی نہ رہی تو پھر حکومت بے کار ہے۔

اس کے بعد بادشاہ تیسری بیگم کے پاس گیا جسے فنا بیگم کہتے تھے، اس نے بڑی گہری بات کہی،

جہاں و حیات و ہمہ بے وفاست
طلب کن فنا را کہ آخر فناست

یعنی جہاں اور حیات دونوں عارضی ہیں، اصل چیز فنا ہے جو یقینی بات ہے۔

بادشاہ دل آرام بیگم کے پاس گیا اور حال بیان کیا۔ اس نے کہا کہ پہلے مجھے شطرنج کا نقشہ دیکھ لینے دیجئے اس کے بعد کچھ عرض کروں گی۔

چناں چہ شاہ جہاں اسے لے گیا۔ دل آرام نے نقشہ دیکھ کر کہا کہ جہاں پناہ مات آپ کو نہیں، حریف کو ہو رہی ہے اور یہ شعر پڑھا،

شاہا دو رخ بدہ و دل آرام را مدہ
فیل و پیادہ پیش کن واسپ گردو و مات

دل آرام نے اس شعر میں شاہ جہاں کو وہ چالیں بتائیں جن سے اس کی جیت یقینی تھی۔

(یہ روایت جہانگیر سے بھی منسوب کی جاتی ہے)

دل آرام بیگم نے جو چالیں بتائیں وہ یہ ہیں،
دونوں رخ پٹوا دیئے جائیں اور فیل پیادہ اور گھوڑے کو آگے بڑھا کر مات دے دی جائے۔
اس سے قبل سفید بازی یعنی شاہ جہاں کی مات یقینی تھی لیکن دل آرام کی بتائی ہوئی چالوں سے بازی الٹ گئی اور سیاہ بازی یعنی ایران کے شہزادہ کو مات ہوئی۔ شعر سے دل آرام کی فنی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

شطرنج دو کھلاڑیوں کے درمیان مربع تختہ پر کھیلا جاتا ہے۔ ذہنی حکمت عملی پر مبنی اس کھیل کا قدیم نام چترُ نگ تھا جو سنسکرت کے الفاظ ''چتو+رانگا'' سے نکلا ہے۔ اس کے معنی چار + بازو کے ہیں۔چار بازوؤں کا مطلب فوج کے چار ڈویژن یعنی پیدل، توپ خانہ، رتھ سوار اور گھڑ سوار تھا۔ ان اقسام کی بنیاد پر شطرنج میں چار مہرے (پیادہ ، فیل ، رخ اور گھوڑا) وجود میں آئے۔عربی میں ''چ'' اور ''گ'' نہیں ہوتے اس لئے عربی میں اس کھیل کا نام شطرنج ہوگیا۔
شطرنج کے قواعد وضوابط مختلف ادوار میں تبدیل ہوتے رہے، آج جن اصول وقواعد کے ساتھ شطرنج کھیلا جاتا ہے اسے معاصر شطرنج کہتے ہیں۔ دسویں صدی میں بغداد کے ابوبکر الصولی اپنے وقت کے ماہر ترین کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔اب شطرنج کی مہارتیں ایشیا سے یورپ وامریکا میں منتقل ہوگئی ہیں۔
شطرنج کے تختہ کو 64 چوکور خانوں میں بانٹا جاتا ہے جو اکثر دو مختلف رنگوں (مثلاً سفید اور سیاہ) میں تقسیم ہوتے ہیں۔اس تختہ کو بساط کہتے ہیں ۔ بساط کے ہر سمت آٹھ خانے ہوتے ہیں۔ دونوں کھلاڑیوں کو کھیل کے آغاز میں الگ الگ 16 مہرے دیئے جاتے ہیں۔ ان میں ایک بادشاہ، ایک وزیر، دو فیل، دو گھوڑے، دو رخ اور آٹھ پیادے ہوتے ہیں۔خانوں کی طرح مہروں کے بھی دو رنگ (مثلاً سفید اور سیاہ) ہیں۔
جیتنے کے لئے مخالف کھلاڑی کے بادشاہ کو شہ مات دینا ہوتی ہے۔بادشاہ کو براہ راست مارا نہیں جاتا، شہ دے کر چاروں طرف سے گھیرا جاتا ہے۔ بادشاہ کو گھیر لیا جائے مگر شہ نہ ہو اور کوئی مہرہ بھی حرکت نہ کر سکے تو پات ہو جائے گی یعنی کھیل بغیر ہار جیت کے ختم!

شطرنج سے مشابہ کھیل نرد ہے جو روایت کے مطابق ہندوستان کے راجا باہبود کے دور میں متعارف ہوا۔نرد کو تختہ نرد اور Backgammon بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نرد پانچ ہزار سال پرانا کھیل ہے جو دو کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں بساط پر رکھے مہرے پانسا پھینک کر پھیلائے جاتے ہیں۔ ہر کھلاڑی یہ مہرے بساط پر ایک طرف سے دوسری طرف چلاتا ہے۔کھلاڑی دو طاس (ڈائس یا چھ رخ کا پانسا) چلاتا ہے اور خیال رکھتا ہے کہ ایک باری میں وہ ان مہروں کو کتنی دور تک لے جاسکتا ہے۔فاتح وہ ہے جو اپنے مہرے بساط پر پہلے پھیلا دے۔

شطرنج کی تاریخی حیثیت مبہم ہے۔نہیں کہا جاسکتا کہ اسے کس نے ، کب اور کہاں ایجاد کیا۔ یونان ، روم ، بابل،مصر، ایران، ہندوستان،عرب سب اس کی ایجاد کے مدعی ہیں ۔بعض نے موجد کا نام حکیم لجلاج ظاہر کیا ہے،بعض نے صہصہہ بن داہر مون اور بعض نے ارسطو لیکن زیادہ رجحان یہی ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ ہندوستان سے ایران پہنچا پھر ایران سے عرب گیا اور اس کے بعد عربوں کی ہسپانوی حکومت کے دوران یورپ میں متعارف ہوا۔

فردوسؔی (ایرانی شاعر) نے عہد خسرو نوشیرواں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ہارون الرشید کا شارلمین (فرانسیسی حکم ران) کوشطرنج کا تحفہ دینا بھی تاریخ میں مذکور ہے ۔عربوں کا اثر اس کھیل پر اتنا پڑا کہ فارسی کی بعض اصطلاحیں عربوں سے لی گئیں۔ چناں چہ ''شہ ماتؔ'' میں لفظ مات عربی ہے جس کے معنی ہیں مر گیا اور یہی لفظ انگریزی میں mate ہوگیا۔

شہ مات شطرنج میں مخالف بادشاہ کو اپنے کسی مہرہ کی یوں شہ دینا کہ وہ اس شہ سے کسی صورت نکل نہ سکے،شہ مات یعنی بادشاہ کو مات کرنا کہلاتا ہے جس کے ساتھ کھیل شہ مات کرنے والے کی جیت پر ختم ہوجاتا ہے۔

مسعودی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں میں علوم وفنون کا بڑا چرچا تھا اور ان کے عہد میں کئی ایجادات ہوئیں۔ان میں سے ایک قابل قدر ایجاد شطرنج کا کھیل ہے جو گپتا خاندان کے ایک راجا کے عہد میں ریاضی دان سیسا نے ایجاد کیا۔سیسا نے انعام میں جو مطالبہ کیا،راجا نے اسے معمولی سمجھا مگر پورا کرنے میں ناکام رہا۔اس نے معروف ریاضی دانوں سے مشورہ کیا۔معلوم ہوا کہ یہ مطالبہ تمام ممالک کے حکم ران مل کر بھی پورا نہیں کرسکتے۔راجا سیسا کے علم و فن سے مرعوب ہوا اور اسے اپنا مشیر بنالیا۔

شطرنج کے موجد کا راجا سے طلب کیا گیا انعام کیا تھا،اب یہ پڑھیے۔موجد نے کہا، بساط شطرنج کے پہلے خانہ پر ایک دانہ چاول رکھ دیا جائے۔دوسرے خانہ پر

دو، تیسرے پر چار، چوتھے پر آٹھ..... یہاں تک کہ اسی طرح دو چند کرتے ہوئے 64 خانے پورے کر دیئے جائیں اور اس کے مطابق رقم انعام میں دی جائے۔ یعنی ایک اور ایک جمع دو اور پھر دو سے ہر نمبر کو ضرب دیں۔ جیسے دو سے چار، چار سے آٹھ، آٹھ سے 16، 16 سے 32، 32 سے 64، 64 سے 128، 128 سے 256، 256 سے 512، 512 سے 1024، 1024 سے 2048، 2048 سے 4096، 4096 سے 8192، 8192 سے 16384..... اور پھر دو سے ضرب دیتے ہوئے جیسے جیسے خانوں کی ترتیب کے مطابق تعداد بڑھتی گئی، اس نے راجا سمیت تمام لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ راجا نے اول اس انعام کو حقیر سمجھا مگر حیران رہ گیا کہ وہ پوری سلطنت بیچ کر بھی یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔

آپ کسی کے سامنے یہ سوال پیش کریں تو وہ قطعاً نہ سمجھ سکے گا کہ ایک کم قیمت چاول 64 ویں خانہ پر پہنچ کے کیوں کر اتنا قیمتی ہو سکتا ہے کہ بادشاہ بھی اس کی ادائیگی سے عاجز رہے۔

شطرنج کھیلنے کے طریقے مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہیں اور مہروں میں کمی بیشی ہوئی ہے۔ چناں چہ مسعودی کے زمانہ میں یہ کھیل بارہ مہروں سے ہوتا تھا جو آدمی اور جانوروں کی شکل کے ہوتے تھے۔

البیرونی نے لکھا ہے کہ شطرنج ہندوستان میں مختلف طریقوں سے کھیلا جاتا تھا لیکن زیادہ عام طریقہ پانسے کے ذریعہ کھیلنے کا تھا۔ بعد میں یہ کھیل مشرق و مغرب ہر جگہ رائج ہو گیا۔ حتیٰ کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں خیموں کے اندر دونوں فریق شطرنج کھیلا کرتے تھے۔

بنیادی طور پر شطرنج دو طرح کھیلی جاتی ہے۔ ایک کا نام رومی شطرنج ہے اور دوسری کا دراز۔ دونوں میں فرق فیل کی چال کا ہے۔ دراز میں فیل ترچھا چلتا ہے جہاں تک اسے جگہ ملے۔ رومی شطرنج میں بھی فیل ترچھا چلتا ہے لیکن صرف تین گھر اور اگر دوسرا مہرہ حائل ہو تو اسے پھلانگ جاتا ہے، یہ نقشہ رومی شطرنج کا ہے۔

سلسلہ سخن میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اصل موضوع یہ تھا کہ ''اضعافاً مضاعفاً'' از روئے ریاضی ایسی بلائے بد ہے کہ موجد شطرنج بھی انعام حاصل نہ کر سکا حالاں کہ اس کا تعلق صرف 64 خانوں کے اضعافاً مضاعفاً چاولوں سے تھا۔

ہمارے متقدمین میں سے بیرونی اور صدفی نے جو حساب پیش کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ شطرنج کے موجد نے انعام کا جو مطالبہ کیا، بظاہر حقیر نظر آتا ہے لیکن دراصل بڑی دولت کا مطالبہ تھا۔

ہمارے یہاں حساب میں گنتی کا شمار یہ ہے،

اکائی، دہائی، سیکڑا، ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، ارب، دس ارب، کھرب، دس کھرب، نیل، دس نیل، پدم، دس پدم، سنکھ، دس سنکھ، مہاسنکھ۔

اگر آپ کو ایک مہا سنکھ ظاہر کرنا ہے تو معنی یہ ہیں کہ ہندسہ (1) کے داہنی طرف 19 صفر رکھنا پڑیں گے۔ اس حساب کے پیش نظر کی گئی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ 64 ویں خانہ پر چاولوں کی تعداد اٹھارہ سنکھ، چوالیس پدم، سڑسٹھ نیل، چوالیس کھرب، سات ارب، سینتیس کروڑ، پچانوے لاکھ، اکیاون ہزار، چھ سو سولہ (18446744073709551616) ہوجائے گی — اور وزن تراسی ارب، اٹھتر کروڑ، اناسی لاکھ، چار ہزار، چار سو دس (83787904410) من، نو (9) سیر، تین ماشہ، سات رتی سات چاول ہوگا۔

کمپیوٹر کی دنیا کا معروف نام، بل گیٹس کا کہنا ہے کہ ایک کے آگے 19 صفر لگائیں تو یہ چاولوں کی وہ تعداد ہوگی جو شطرنج کے تمام خانوں میں آئے گی۔ اس نے مزید بتایا کہ اگر ایک بوری چاول میں اوسطاً ایک ارب چاول ہوں تو ان چاولوں کو بھرنے کے لئے 18 ارب بوریاں درکار ہوں گی۔ یہ مقدار چاول کی کل عالمی پیداوار سے بھی زائد ہے۔

قارئین! یہ ہے اضعافاً مضاعفاً کی برکت کہ ایک چاول 64 ویں خانہ میں پہنچ کر تقریباً 84 ارب من ہوجاتا ہے اور اگر اس کی قیمت کم سے کم تین ہزار روپے فی من قرار دی جائے تو یہ رقم 2520 کھرب روپیہ ہوجاتی ہے جو 18 کھرب ڈالر کے برابر ہے۔

(یہ مضمون جناب نیاز فتحپوری کی تحریر سے ماخوذ ہے)

ہر پتھر سونا نہیں ہوتا

بادشاہ نے شہزادہ کو ادیب کے سپرد کیا اور کہا اس کی تربیت اس طرح کرو جیسے اپنے بچوں کی کرتے ہو۔ ادیب نے ایک سال شہزادہ پر محنت کی مگر کوشش کارگر نہ ہوئی — وہ ادیب کے بچوں جیسا بن نہ سکا۔ ادیب کے لڑکے عالم، فاضل اور انشا پردازی میں ماہر ہوگئے جب کہ شہزادہ کی دل چسپی قائم نہیں ہوئی۔

ایک سال کے بعد شہزادہ محل واپس پہنچا۔

اگلے روز بادشاہ نے ادیب کو طلب کیا۔ وہ نہایت برہم تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا، تو نے وعدہ خلافی کی، وفاداری نہیں کی۔

ادیب نے کہا، جناب عالی! زمین و آسمان کا مالک گواہ ہے کہ میں نے سب کی تربیت یکساں کی لیکن طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔

بادشاہ مفہوم سمجھ گیا اور خاموش رہا۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ اگرچہ سونا چاندی پتھر سے نکلتا ہے لیکن ہر پتھر میں سونا چاندی نہیں ہوتا۔ ہیرا کوئلے سے بنتا ہے لیکن ہر کوئلے میں ہیرا نہیں ہوتا۔

شاگردوں کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے استاد کی تربیت کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ شرط یہ ہے کہ شاگرد اپنی نفی کرکے استاد کی افتادِ طبع کو قبول کرلے — اور اس میں وقت لگتا ہے۔

علیم احمد

کمپیوٹر اور املا نویسی

ڈپریشن یا ذہنی بیماری میں مبتلا افراد یہ مشق ضرور کریں، تھکاوٹ محسوس ہوگی لیکن اس ورزش سے دماغی اور حرکی اعصاب میں رابطہ مضبوط ہوتا ہے اور ذہنی صحت بہتر ہوتی ہے۔

''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔'' (العلق: ۱۔۵)

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔'' (القلم:۱)

ان آیات میں قلم کا تذکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریمؐ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں ''اقرأ'' کو جس انداز سے قلم اور علم کے ساتھ مربوط فرمایا ہے، اس میں رموز ہیں۔ واضح رہے کہ پہلی وحی سورہ علق کی آیات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح سورہ قلم کی ابتدا ''قلم'' کی قسم سے کی گئی ہے اور اسی تسلسل میں ''جو کچھ کہ وہ لکھتے ہیں'' ان الفاظ کے ساتھ قلم کی قسم کھائی ہے۔ دونوں مقامات پر قلم کے تذکرہ میں گہرے مفہوم ہیں۔

تمام مذاہب اور تہذیبوں میں قلم کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے پہلے دنیا کے ہر نظام تعلیم میں پڑھنے کے ساتھ قلم کے ذریعے لکھنے کی قابلیت اہم ترین ابتدائی تقاضوں میں شامل رہی ہے۔

ایک وقت تھا جب ابتدائی جماعتوں کے طالب علموں سے ''تختی'' لکھوائی جاتی تھی۔ اس سے لکھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا اور لکھائی صاف ہوتی۔ مگر کیا قلم کی صرف یہی افادیت ہے ــــ؟

کاغذ قلم بمقابلہ کمپیوٹر مانیٹر اور کی بورڈ:

قلم اور کاغذ کی حیثیت اوزاروں کی ہے جن کی مدد سے طلبا لکھنا اور پڑھنا سیکھتے ہیں۔ کی بورڈ پر ٹائپ کرنے اور کتاب کے بجائے مانیٹر (کمپیوٹر اسکرین) سے پڑھنا عام ہے۔ اس طرح قلم اور کاغذ کی اہمیت محدود کر دی گئی ہے۔ بچوں کو ایسے اسائنمنٹ دیئے جاتے ہیں جنہیں کمپیوٹر پر بنانا پڑتا ہے۔

کمپیوٹر کے فوائد جہاں مثبت ہیں، وہاں اس پر ضرورت سے زیادہ انحصار کے نتائج منفی بھی ہیں۔

نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے تعلیمی نفسیات کے میدان میں تحقیق کی ضرورت ہے۔

قلم، کاغذ اور جدید نفسیاتی مطالعات:

سوال یہ ہے کہ،

۱۔ کیا قلم صرف اوزار ہے یا اس کے دیگر فوائد ہیں؟

۲۔ کیا قلم اور کاغذ کے مقابلہ میں کی بورڈ اور مانیٹر کو بہتر متبادل قرار دیا جاسکتا ہے؟

۳۔ کیا وسیع تر تناظر میں قلم کا تعلق سیکھنے کی صلاحیتوں یعنی اکتساب سے ہے یا نہیں؟

2012ء میں انڈیانا یونیورسٹی کے نفسیات دانوں نے چھوٹے بچوں پر تحقیق کی جنہوں نے ابھی پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ انہیں حروف تہجی پر مشتمل کارڈز دینے کے بعد تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ ایک گروپ سے کہا گیا کہ وہ حروف تہجی کو کاغذ پر لکھے۔

۲۔ دوسرے سے حروف کی آؤٹ لائن بنانے (یعنی حروف کوٹریس کرنے) کے لئے کہا گیا۔

۳۔ تیسرے گروپ کو کمپیوٹر کی بورڈ پر حروف تلاش کر کے ٹائپ کرنے کا کام سونپا گیا۔

بالغ افراد میں پڑھنے اور لکھنے سے متعلق دماغ کے تین حصے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ بائیں تکلہ نما تلفیت (Left fusiform gyrus)

۲۔ اسفل جبہی تلفیت (Inferior frontalgyrus)

۳۔ موخر جداری قشرہ (Posterior parietal cortex)

پیدائش کے وقت تینوں حصے موجود ہوتے ہیں مگر ان میں سرگرمی لکھنے اور پڑھنے سے شروع ہوتی ہے۔

بچوں کو برین scanner میں بٹھایا گیا اور وہی حروف تہجی دکھائے گئے۔ ٹائپنگ کرنے والے یا کاغذ پر آؤٹ لائن بنانے والے بچوں کے دماغ میں خاص سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ البتہ ہاتھ سے کاغذ پر حروف لکھنے والے بچوں کے مذکورہ بالا تینوں حصوں میں واضح تحریک نظر آئی یعنی ان میں پڑھنا لکھنا سیکھنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ دیگر بچوں کے دماغ اس عمل کے لئے تیار نہیں تھے کیوں کہ انہوں نے حرف کو محض ایک شکل سمجھا۔

ایسا کیوں ہوا—؟ محقق کہتے ہیں کہ جب بچہ قلم یا پنسل سے کوئی حرف لکھتا ہے تو پہلے وہ اس کی ساخت کو سمجھتا ہے پھر اپنے انداز میں نقل کرتا ہے۔ کوشش کے نتیجہ میں حرف کو اصل حرف کی طرح نہیں بنا پاتا البتہ اس جیسی شکل بنانے میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے یعنی اپنے انداز میں لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

قلم سے لکھنے میں سب سے پہلے دماغ میں موجود اعصابی خلیات (brain neurons) خاص نوعیت اور شدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ یہ اعصابی سرگرمی دراصل اطلاع ہے جو دماغ سے ہوتی ہوئی ہاتھ کے پٹھوں سے منسلک حرکی اعصاب (موٹر نیورونز) تک پہنچتی ہے۔ موٹر نیورونز ہدایت کے مطابق حرکت

کرتے ہیں، نتیجہ میں کاغذ پر مطلوبہ حرف کی شکل ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کوشش، انسانی دماغ میں اکتسابی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مدد کرتی ہے۔

اسی طرح کی ایک تحقیق میں بچوں کے دو گروپ تشکیل دیئے گئے۔ ایک کو مختلف حروف لکھنے کے لئے کہا گیا جب کہ دیگر بچوں نے پہلے گروپ کی سرگرمی پر غور کیا۔ نتیجہ یہ رہا کہ قلم کے ذریعے لکھنا ان بچوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جو عملی مشق کرتے ہیں — قریب بیٹھ کر دیکھنے والوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

ہاتھ سے لکھنے کی اہمیت یہیں تک نہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کسی لفظ کی آؤٹ لائن بنانا، اسے کی بورڈ کی مدد سے ٹائپ کرنا اور ہاتھ کی مدد سے قلم کے ذریعے لکھنا — تینوں سرگرمیوں کا تعلق دماغ کے جدا گانہ نمونوں (Brain Patterns) سے ہے۔ انہوں نے واضح طور پر مشاہدہ کیا کہ قلم سے لکھنے والے بچے تصورات کو بہتر طور پر بیان کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس سے بچوں کی مشاہداتی (cognitive) صلاحیتوں کی نشوونما میں مدد ملتی ہے، ذہن میں نئے تصورات پیدا ہوتے ہیں۔

جب بچوں سے کہا گیا کہ وہ کسی کمپوزیشن (نظم یا نثر کی صورت میں بیان) کے بارے میں خیالات پیش کریں تو ہاتھ سے لکھنے والوں کی کارکردگی بہتر تھی۔ جن بچوں کی لکھائی خوش نما تھی ان میں عملی یادداشت (ورکنگ میموری) اور پڑھنے لکھنے سے متعلق اعصابی خلیات کی مجموعی کارکردگی زیادہ رہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قلم استعمال کرتے ہوئے تحریر کا عمل یادداشت اور خواندگی سے وابستہ استعداد کو پروان چڑھاتا ہے اور تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔

تعلیمی نفسیات کے ماہرین کو قلم کے کم ہوتے استعمال پر شدید تشویش ہے۔ گزشتہ برسوں کی تحقیق بتاتی ہے کہ Dysgraphia* اور Dyslexia* جیسے اعصابی امراض کا ہاتھ سے لکھنے کی مشق کے ذریعے خاطر خواہ علاج کیا جاسکتا ہے۔ یہ مرض زیادہ تر بچوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کا ذاتی تجربہ پڑھئے۔

ڈپریشن سے مقابلہ: 2008ء میں شدید مسائل کی وجہ سے مجھے ڈپریشن ہوگیا۔ اس سے پہلے ڈپریشن تین یا چار دن تک دوا (اینٹی ڈپریسنٹ) کھانے کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ ڈپریشن کی ظاہری علامات میں مسلسل نیند آنا، بے وجہ مایوسی اور فکرمندی کا مسلط رہنا، طویل نیند کے بعد تھکن محسوس کرنا، کسی چیز میں دل نہ لگنا، ہر وقت اکتاہٹ اور چڑچڑاپن وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ مسلسل ایک ہفتہ تک ڈپریشن کی دوا کھانے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ دوا کے منفی اثرات کے خوف

---

*Dysgraphia (لکھنے میں مشکل درپیش آنا) *Dyslexia (پڑھنے میں مشکل درپیش آنا)

کے تحت ایک ہفتہ کے بعد دوا لینا چھوڑ دی ۔کیفیت بڑھنے سے حالت خراب ہوگئی۔

میں تحریر و ادارت کے تقریباً تمام کام براہ راست کمپیوٹر پر کرتا تھا۔تصنیف وتالیف اور ادارت کا کام بہت توجہ طلب ہے ۔کئی گھنٹے مسلسل توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کام کرنا پڑتا ہے۔

2009ء کے اختتام تک ڈپریشن اس حد تک بڑھ گیا کہ کمپیوٹر پر دس سے پندرہ منٹ کام کرنے کے بعد شدید ذہنی تھکن محسوس ہوتی ــــ اور آٹھ گھنٹے دماغ پر دباؤ رہتا جس سے دیگر معمولات متاثر ہوگئے۔

تنگ آ کر کمپیوٹر ایک طرف رکھا اور کاغذ قلم نکال لیا۔ کاغذ پر انگریزی مضمون سامنے تھا،عبارت دیکھ کر ذہن میں اردو ترجمہ مرتب کرتا اور قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل کر دیتا۔ پہلے دن بمشکل دس منٹ کی مشق کے بعد ایک پیراگراف کا ترجمہ کیا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں تو ہاتھ روک دیا۔

دوسرے دن پھر یہی مشق کی ۔نتیجہ پہلے دن جیسا تھا۔ جبر کر کے دوا کھائے بغیر جیسے تیسے یہ سلسلہ ایک مہینہ جاری رکھا۔ڈپریشن میں نمایاں کمی محسوس ہوئی۔ اگرچہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا لیکن شدت نہیں تھی۔

اب میں مسلسل دو گھنٹے تک نہ صرف قلم سے لکھ سکتا تھا بلکہ کمپیوٹر پر زیادہ دیر تک کام کرتا تھا۔کوئی شک نہیں کہ اس ذہنی مشقت کے اختتام پر شدید تھکن ہو جاتی لیکن اکتاہٹ یا چڑچڑاہٹ نہیں تھی ــــ خوش گوار احساس تھا۔

اعصاب میں رابطے : ہاتھ سے تحریر کا تعلق براہ راست دماغ سے ہے۔انسانی دماغ کھربوں اعصابی خلیات کا مجموعہ ہے۔ یہ معمولی خلیے نہیں ہوتے ۔ہر اعصابی خلیہ (عصبیہ ۔ نیورون) بیک وقت کئی ہزار اعصابی خلیوں سے جڑا ہے اور *synapses کے ذریعے دوسرے خلیہ سے منسلک ہے۔

ریاضی کی مشقیں، معمے، پہیلیاں، مطالعہ، سوچ بچار، غور وفکر، لکھنا پڑھنا ــــ ایسی شعوری سرگرمیاں ہیں جو اعصابی خلیات کے باہمی ربط کو (synapses) مضبوط بناتی ہیں۔نتیجہ میں دماغ طاقت ور ہوتا ہے۔

وہ کیسے ــــ؟ آگے پڑھئے۔

جب ہم کچھ سوچتے یا کوئی کام انجام دیتے ہیں تو متعلقہ خلیات کے درمیان synapse کے مقام پر برقی سرگرمی بڑھ جاتی ہے۔حرکت ''حکم'' کی شکل میں متعلقہ خلیوں کو تحریک دیتی ہے، برقی رو ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے synapse کے راستے اضافی برقی سرگرمی کی شکل میں سفر کرتی ہوئی دماغ سے متعلقہ عضو کے حرکی عصبیوں (motor neurons) تک پہنچتی ہے ، اور ان پٹھوں میں حرکت پیدا کرتی ہے۔

---

*وہ ''جنکشن'' جہاں دو اعصابی خلیات جڑتے ہیں، synapse کہلاتا ہے۔

ٹائپنگ، ہاتھ سے لکھنا اور سائنیپسز: غور کیجئے کہ ہاتھ سے لکھنے اور ٹائپ کرنے میں کیا فرق ہے ــــ ؟ ٹائپ رائٹر ہو یا کی بورڈ، دونوں میں حروف کی قطاریں ہیں۔ ٹائپنگ سیکھنے والا فرد جانتا ہے کہ ٹائپنگ شروع کرتے وقت انگلیاں حروف کی درمیانی قطار پر رکھی جاتی ہیں۔ ٹائپنگ سیکھنا دراصل کی بورڈ یا ٹائپ رائٹر پر کلیدوں (keys) کی ترتیب یاد کرنا ہے۔ اس دوران انگلیوں کو ترتیب کے مطابق حرکت دی جاتی ہے اور مخصوص قوت اور پھرتی سے کسی کلید (key) کو دبایا جاتا ہے۔ سمجھنے کے لئے کی بورڈ یا ٹائپ رائٹر پر حروف تہجی والی کلیدوں کی ترتیب دیکھئے۔

بالائی قطار: QWERTYUIOP

درمیانی قطار: ASDFGHJKL

نچلی قطار: ZXCVBNM

ٹائپنگ کرتے ہوئے ہم بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں (انگوٹھے کو چھوڑ کر) بائیں جانب والی کلیدوں ASDF پر ــــ جب کہ دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں دائیں جانب کی کلیدوں (:JKL) پر رکھتے ہیں۔ کسی بھی ہاتھ کا انگوٹھا اسپیس بار پر رکھا جاتا ہے تاکہ الفاظ کے درمیان فاصلہ رہے۔

غور کیجئے ٹائپنگ کے دوران ذہن حرف کو بنانے کا حکم نہیں دیتا بلکہ متعلقہ انگلی کو مطلوبہ کلید (key) تک پہنچ کر تیزی سے دبانے اور ابتدائی پوزیشن پر واپس آنے کا حکم دیتا ہے۔ اس میں وہ محنت نہیں، جو ہاتھ سے لفظ بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ ہاتھ سے لکھنے کے لئے synapses کی تحریک کا درست ہونا ضروری ہے ورنہ معمولی لکیر بھی کاغذ پر ٹھیک طرح سے نہیں بنتی۔

ڈپریشن یا ذہنی بیماری میں مبتلا افراد یہ مشق ضرور کریں، تھکاوٹ محسوس ہوگی لیکن اس ورزش سے دماغی اور حرکی اعصاب میں رابطہ مضبوط ہوتا ہے اور ذہنی صحت بہتر ہوتی ہے۔

درس و تدریس اور قلم: ذہنی و اعصابی امراض کی بحث اپنی جگہ، تاہم یہ حقیقت ہے کہ درس و تدریس کے میدان میں قلم کی اہمیت ایک بار پھر سے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ برقی کیلکولیٹر اور ایسے دوسرے آلات کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن جب معاملہ درست تدریس اور ذہن کے خلیوں سے کام لینے کا ہو، نئی نسل کو تصورات سمجھنے اور بیان کرنے کے قابل بنانے کا ہو، تخلیقی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں درست رفتار کے ساتھ پروان چڑھانے کا ہو تو پھر سوچ سمجھ کر فیصلے کرنا ہوں گے۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ قلم اور کاغذ کا استعمال دقیانوسی اور فرسودہ ہے۔ البتہ یہ حکمت عملی زیادہ مناسب ہے کہ کاغذ، قلم اور کمپیوٹر کو موزوں و متوازن انداز میں تدریس کا حصہ بنایا جائے ورنہ مشینوں پر حد سے زیادہ انحصار محتاجی میں تبدیل ہو جائے گا۔

محمد سعید انور

زمستانی افسردگی

سردی کا موسم لاہور کے مکینوں کی زبان میں ''کھابوں'' کا موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں طرح طرح کے روایتی پکوان، ڈرائی فروٹ، انواع و اقسام کے سوپ، یخنی، چائے، کافی اور دیگر مشروبات اور کھانوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔

دل چاہتا ہے کہ کھانا زیادہ کھائیں جیسے سردیوں کی نہیں، صدیوں کی بھوک ہو۔ لگتا ہے کہ جسم کھانا نہیں کھا رہا بلکہ کھانا جسم کو کھا رہا ہے۔

سردی میں کھایا پیا جسم کو لگتا ہے اور عموماً نظام انہضام بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ جو چاہیں کھائیں، جس شے کو جی چاہتا ہے ضرور کھائیں لیکن اعتدال میں تاکہ وقت بے وقت کام کرنے کی وجہ سے ہاضمہ کی مشینری متاثر نہ ہو۔

سب جانتے ہیں کہ سردیوں میں بھوک بڑھ جاتی ہے لیکن کیا آپ نے سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جسم کا نارمل درجۂ حرارت 98.6F ہوتا ہے۔ سردیوں میں درجۂ حرارت کم ہونے سے جسم کا درجۂ حرارت بھی کم ہونے لگتا ہے۔ نتیجہ میں جسم سرد ہو جاتا ہے۔ جب سرد کی بہ نسبت جسم گرم رہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم غذائیت سے بھرپور خون کا حامل ہے اور جب جسم کا درجۂ حرارت گرنے لگتا ہے تو دراصل یہ جسم کا ذہن کو پیغام بھیجنا ہے کہ خون میں غذائیت کی کمی ہو رہی ہے۔ نتیجہ بھوک کی تحریک کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

جسمانی نظام کو گرم رکھنے کے لئے زیادہ کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اضافی کیلوریز خوراک میں اضافہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ خوراک میٹابولزم کو بڑھاتی ہے۔ میٹابولزم کا بڑھنا جسم کے درجۂ حرارت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

سردیوں میں بھوک میں اضافہ کی ایک وجہ ڈی ہائیڈریشن کا ہونا ہے یعنی پانی کی کمی۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ڈی ہائیڈریشن صرف گرمیوں میں ہوتی ہے یہ نظریہ درست نہیں۔ سردیوں میں پیاس کم لگنے کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے اور یہ کمی گرمیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ پہلی وجہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ سردیوں میں کم پانی پینا۔ دوسرا یہ کہ سردی سے بچنے کے لئے ہیٹر وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گرمائش کا یہ انتظام جسم میں پانی کی کمی کا باعث بنتا ہے۔

ڈی ہائیڈریشن یا پانی کی کمی کی صورت میں پیاس، سردرد، پٹھوں کا اکڑنا، پیشاب کا گہرے رنگ اور مقدار میں کم ہونا شامل ہے۔ یہ خصوصیات پانی کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں لہٰذا روزانہ آٹھ گلاس پانی لازمی پینا چاہئے۔ ڈی ہائیڈریشن کے سبب جسم کا خودکار نظام بھوک بڑھا کر خوراک کے ذریعے پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تاہم سردیوں میں بھوک میں اضافہ کی ایک وجہ نفسیاتی بھی ہے۔ زیادہ سرد راتوں میں سردی کی وجہ سے خاص قسم کا ڈپریشن پیدا ہوتا ہے یہ seasonal affective disorder (SAD) کہلاتا ہے۔ اسے زمستانی افسردگی* بھی کہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ دماغ میں ایک کیمیکل serotonin ہے۔ ڈپریشن serotonin کی سطح کو کم کر دیتا ہے۔ نتیجہ میں دماغ جسم کو کھانے کا حکم جاری کرتا ہے اور بلند کاربوہائیڈریٹس والی خوراک سے serotonin کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ Serotonin ایک اور طریقہ سے بھی خوراک میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ سردیوں میں دن چھوٹے اور جسمانی حرکات محدود ہو جاتی ہیں۔ جسمانی حرکات میں کمی serotonin کی سطح کو کم کرتی ہے اور بھوک میں اضافہ کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ فربہ جسم اور کاہل لوگوں کی بھوک بڑھنے کی وجہ کیا ہے۔

سردیوں میں ہائی کیلوریز کاربوہائیڈریٹس سے بھرپور خوراک کی وجہ سے وزن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق عام آدمی کا وزن ایک سے تین پاؤنڈ تک بڑھ جاتا ہے لیکن وہ افراد جو پہلے سے زائد وزن رکھتے ہیں خصوصاً خواتین، تو وہ مزید موٹاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کچھ مشورے تجویز کئے جا رہے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ان مشوروں پر عمل کر کے کوئی بھی فرد نہ صرف سردیوں میں خوراک سے لطف اندوز ہو سکتا ہے بلکہ وزن کو بھی کنٹرول میں رکھ سکتا ہے۔

★ زیادہ پروٹین والا ناشتہ کریں جیسے انڈا، گوشت، مچھلی، دالیں وغیرہ۔

★ آٹھ گلاس پانی لازمی پئیں۔

★ اسٹریس (تناؤ) کو کم کریں۔

★ باقاعدگی سے ورزش کریں۔

★ ٹھوس غذاؤں کے بجائے جسم کو گرم رکھنے کے لئے چائے، کافی، یخنی، سوپ، بیجوں اور سبزیوں والے سوپ استعمال کریں۔ ان سے میٹابولزم بڑھتا ہے۔

★ خوش رہنے کی کوشش کریں تاکہ انڈارفین خارج ہو۔ خوشی کے عمل میں خارج ہونے والے کیمیائی مادوں میں انڈارفین بھی ایک مادہ ہے۔ اس طرح زمستانی افسردگی کے عارضہ میں کمی آتی ہے۔

---

* زمستانی افسردگی (موسم سرما میں اداسی کا عارضہ)

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور و فکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل و دانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

السلام علیکم پیارے بچو!

گاجروں کا موسم ہے۔ بازار میں سرخ میٹھی مزے کی گاجریں دستیاب ہیں۔ گاجریں کھانے سے خون بنتا ہے اور نظر تیز ہوتی ہے۔ گاجر کو گول گول کاٹیں تو اس میں آنکھ کی تصویر نظر آئے گی۔ جی ہاں! غور سے دیکھیں، گاجر میں گول گول دھاریاں ہیں جس کے اندر آنکھ کا ڈیلا اور ڈیلے میں تل ہے۔

گاجر کا رس نکالنے کے لئے جب قاشیں جوسر مشین میں ڈالتے ہیں تو کٹ کٹ کٹ آواز آتی ہے۔ مشین میں مختلف خانے ہوتے ہیں، اس میں چھلکے اور گودا الگ ہوجاتا ہے، اور رس برتن میں آجاتا ہے۔ ہمارے پیٹ میں بھی ایک نظام ایسا ہے کہ گاجر اس میں جاتے ہی پسنے کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ جن اعضا کو جوس کی ضرورت ہے، جوس وہاں چلا جاتا ہے اور چھلکے الگ ہوجاتے ہیں۔ اپنے جسم پر ضرور غور کریں۔ اور بچو! جب کبھی پیٹ خالی ہو تو اس میں سے آوازیں آتی ہیں ــــ سنا ہے کہ خالی پیٹ میں چوہے دوڑتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے ــــ؟

مشق یہ ہے کہ پھل، خشک میوے اور سبزیوں میں آپ کو جس چیز کی تصویر نظر آئے، اس کا نام لکھ کر بھیج دیں۔ جیسے بادام کی شکل آنکھ جیسی ہے۔ جو بچہ جتنے زیادہ نام بتائے گا، اسے ''شاد باش'' ملے گی۔ جوابات بھیجنے کی آخری تاریخ 20 فروری 2019ء ہے۔

دسمبر 2018ء میں سوال تھا کہ پرندے روز ایک طرح کا کھانا خوشی خوشی کیسے کھا لیتے ہیں؟ یہ کون سا نظام ہے کہ ہر روز لاشمار مخلوق کو بے حساب کھانا ملتا ہے لیکن کھانا ختم نہیں ہوتا۔ ماشاءاللہ بڑی تعداد میں بچوں کی جانب سے خطوط موصول ہوتے ہیں۔ منتخب خطوط میں سے چند شائع کئے جا رہے ہیں۔

وانیہ، جماعت پنجم (کراچی): پرندے معصوم ہیں، صبر و شکر کرتے ہیں اس لئے اللہ ان کے کھانے میں روز نیا ذائقہ ڈالتے ہیں۔

سید احمد علی، جماعت سوم (لاہور): پرندوں کا کھانا ایک قسم کا اور ہمارے مختلف ہیں۔ اس وجہ سے ہمارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ لالچ ہے۔ کھانا ختم نہیں ہوتا کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دسترخوان ہے اور اللہ تعالیٰ کا دسترخوان بہت بڑا ہے۔

قرۃ العین کاشف، جماعت چہارم (لاہور): اباجی آپ کا بہت شکریہ۔ آپ ہر مہینہ ہمیں نئی نئی باتیں سمجھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں۔ ہم اپنی ماما کے ساتھ ان پر غور کرتے ہیں جس سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ پرندے روز ایک کھانا شوق سے کھاتے ہیں کیوں کہ وہ شکر ادا کرنے والے ہیں اور آدمی ناشکرا ہے۔

عافیہ، جماعت پنجم (کراچی): پرندے ہر وقت خوش رہتے ہیں اس لئے وہ خوش ہو کر کھاتے ہیں۔

قاسم محمود، جماعت سوم (کوئٹہ): دادی اماں نے بتایا ہے کہ ہمیں لگتا ہے کہ پرندوں کا کھانا ایک ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم ان کے ایک ہی کھانے سے واقف ہیں۔ اللہ نے باجرے کے ساتھ قسم قسم کے حشرات کو پرندوں کی خوراک بنایا ہے۔

سفینہ علی، جماعت ہفتم (سوات): ہم بھی ایک طرح کا کھانا روز کھاتے ہیں، مگر مسالے اور دوسری چیزیں ڈالنے کی وجہ سے ترکیب الگ ہو جاتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہر روز نیا کھانا کھا رہے ہیں۔

ماجد ہارون، جماعت ششم (کراچی): پرندوں کو ایک کھانا کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ جیسے چھوٹے بچے صرف دودھ پیتے ہیں۔ اگر دوسری چیز کھلائیں گے تو وہ کھالیں گے۔

شاہ میر، جماعت چہارم (اسلام آباد): اللہ تعالیٰ بادشاہ ہیں جو ہر شے تخلیق کرتے ہیں۔ وہی پرندوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور ساتھ ساتھ مزید کھانے کا بھی انتظام فرماتے ہیں۔

حفصہ طارق، جماعت سوم (پاک پتن): ہمارے گھر کے پاس جو پرندے رہتے ہیں، وہ اب بہت ہوشیار ہو گئے ہیں، دوسری چیزیں بھی کھا لیتے ہیں۔ میں نے بتاشے کے ٹکڑے کئے، تھوڑی دیر بعد چڑیا آ کر لے گئی۔

جواب بھیجنے والے دیگر بچوں کے نام: رمیشہ، شنزہ، عامر، کشف، سمعیہ، لائبہ علی، حبیبہ، کشف ناز، فاطمہ شعیب، علیشبہ زاہد، رامین اسرار، نبیر نعمان، ذاکر، زینب، شاہینہ، رجاء، شانزے، نجاہ، ساجد، نور فاطمہ، راشدہ، شگفتہ، حیا فاطمہ، فرح، ماہ نور۔

نوٹ: بچو! سوال کو سمجھنے کے لئے آپ اپنے اماں ابا اور اساتذہ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

ناشکرا بادشاہ

کسی بادشاہ کی بہت بڑی سلطنت تھی لیکن اس کی اولاد نہیں تھی۔ وہ بہت اداس رہتا تھا۔

ایک روز نہ جانے دل میں کیا بات آئی کہ اس نے بھیس بدلا اور شہر سے باہر ایک درخت کے نیچے چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اس راستہ سے کئی لوگ گزرتے تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ پاگل ہے۔ اکثر لوگ بادشاہ پر پیر رکھ دیتے۔

ادھر محل میں بادشاہ کی غیر موجودگی سے سب پریشان ہوگئے اور تلاش شروع کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بادشاہ بھیس بدل کر جس درخت کے نیچے لیٹا تھا، ایک روز وہاں سے درویش کا گزر ہوا۔ انہوں نے درخت کے نیچے بوسیدہ کپڑوں میں کسی کو لیٹے دیکھا تو پوچھا، میاں! خیر تو ہے جو سڑک کنارے اس طرح لیٹے ہو؟ بادشاہ نے ناگواری سے جواب دیا، جان کر کیا کرو گے؟ جیسے دوسرے لوگ میرے اوپر سے گزر جاتے ہیں، تم بھی گزر جاؤ۔

درویش نے کہا، میں زمین پر چلتے ہوئے احتیاط کرتا ہوں کہ کہیں چیونٹی پیروں تلے نہ آجائے پھر آدمی کے اوپر سے کیسے گزر جاؤں۔ کوئی مشکل ہے تو بتاؤ — غم بتانے سے کم ہوتا ہے۔

بادشاہ درویش کے نرم رویہ سے متاثر ہوا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل کا حال بتایا اور یہ بھی بتادیا کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔

درویش نے کہا، جمعہ کے دن نہا کر اجلے کپڑے پہننا۔ اور تیر کمان اٹھا کر باغ میں کسی پھل دار درخت میں جا کر تیر مارنا، جتنے پھل گریں گے اتنے بیٹے اور جتنے پتے گریں گے اتنی بیٹیاں پیدا ہوں گی۔ پھل اور پتے ملکہ کو کھلا دینا۔ اللہ کے فضل سے کام ہوجائے گا۔

درویش کی ہدایت کے مطابق بادشاہ نے جمعہ کے دن اللہ کا نام لیا اور آم کے درخت پر تیر مارا، دو پتوں سمیت ایک آم گرا۔ بادشاہ نے آم ملکہ کو کھلایا اور دونوں پتے اپنی گھوڑی کو کھلا دیئے۔

کچھ عرصہ بعد شہزادہ کی ولادت ہوئی۔ دوسری طرف گھوڑی کے ہاں دو مادہ پیدا ہوئیں۔

ایک روز درویش کا محل کے پاس سے گزر ہوا۔

بادشاہ سے پوچھا، اللہ نے کتنی اولادوں سے نوازا؟ بادشاہ کو لالچ ہوا اور سوچا کہ اگر فقیر کو بتاؤں کہ بیٹا ہوا ہے تو وہ مزید بیٹوں کی دعا نہیں کرے گا۔

اس نے درویش سے جھوٹ بولا، میری دو بیٹیاں پیدا ہوئی ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ بیٹے سے نوازے۔

درویش نے کہا، دو بیٹیاں کافی نہیں؟ اور اگر تمہارا بیٹا پیدا نہیں ہوا تو پھر کس کا پیدا ہوا ہے ــــ؟

بادشاہ انجان بن گیا۔ درویش محل سے چلا گیا۔

بچو! بادشاہ نے بددیانتی کی اور درویش سے جھوٹ بولا۔ جھوٹ کا انجام برا ہوتا ہے۔

وقت گزرا اور شہزادہ جوان ہو گیا۔ ادھر گھوڑیاں بھی بڑی ہو گئیں۔ ایک دن شہزادہ کا شکار پر جانے کو دل چاہا۔ گھوڑی پر زین کسی۔ دوسری گھوڑی پر محافظ سوار ہوا۔ جنگل کے بیچ میں پہنچے تو شہزادہ کو ایک قلعہ نظر آیا۔ وہ حیران ہوا۔ قلعہ کے باہر سو کے قریب افراد تھے جو دروازہ بند کرنے کے لئے زور لگا رہے تھے لیکن ہر ممکن کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہوئے۔ شہزادہ کو یہ منظر عجیب لگا۔ وہ قریب گیا اور پوچھا کہ ماجرا کیا ہے، قلعہ کس کا ہے اور آپ لوگ پریشان کیوں ہیں ــــ؟ لوگوں نے شہزادہ سے کہا، بہتر یہ ہے کہ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ اس دروازہ کی چوکھٹ پار کر کے اندر جانے والا واپس نہیں لوٹتا۔ شہزادہ نہیں مانا اور سپاہی کو اشارہ کیا۔ دونوں نے دروازہ بند کرنے کے لئے زور لگایا۔ اس کوشش میں شہزادہ کا پاؤں پھسلا اور وہ قلعہ کے اندر جا گرا۔ شہزادہ کے گرتے ہی دروازہ خود بخود بند ہونے لگا لیکن ــــ اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہوتا، دونوں گھوڑیاں بھی قلعہ میں داخل ہو گئیں۔

اندر کی دنیا باہر کی دنیا سے الگ تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی اور جہان میں آ گیا ہے۔ سامنے سفید داڑھی اور سفید لباس میں خوب صورت درویش تخت پر تشریف فرما تھے۔ شہزادہ کو دیکھا تو گلے لگا لیا۔

اِس دنیا کا شہزادہ اُس دنیا میں بہت خوش تھا۔ قلعہ سے باہر جانے کا خیال ذہن سے نکل گیا۔ وہ بھول گیا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور وہ کس دنیا سے آیا ہے۔ باہر موجود سپاہی نے محل پہنچ کر بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ سخت پریشان سپاہیوں سمیت جنگل میں آیا لیکن قلعہ کا نام و نشان نہیں تھا۔

بچو! کہانی پڑھ کر آپ کیا سمجھے اور کیا نہیں سمجھے؟ اماں، ابا، بہن بھائیوں سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

شبنم کمالی

پیار کی دنیا آؤ بسائیں

ننھے منے محل بنائیں
عدل کا ایک بازار لگائیں
الفت کی دوکان سجائیں
علم و ہنر کی شمع جلائیں
پیار کی دنیا آؤ بسائیں

ننھا سا اسکول بنا کر
اچھے اچھے پھول لگا کر
امن و سکون کا راز بتا کر
علم و عمل کا رنگ دکھائیں
پیار کی دنیا آؤ بسائیں

چمکیں چاند کی کرنیں پیاری
جیسے میٹھی نہریں جاری
مستی میں ہو باد بہاری
گیت خوشی کے پھر ہم گائیں
پیار کی دنیا آؤ بسائیں

رنگ برنگ تتلی

تتلی نے چھوٹے چھوٹے انڈے دیئے۔ چند دنوں کے بعد انڈوں میں سے ننھے منے کیڑے نکلے۔ پڑوسیوں نے اماں تتلی کو مبارک باد دی۔ وہ خوش ہوئیں اور بچوں کو کلیجے سے لگایا۔

ننھے منے کیڑے خود کھانا کھانے کے قابل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ جس پودے پر بسیرا ہے وہاں پتے ہی پتے ہیں۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ بھوک لگتی اور پتے کھانا شروع کر دیتے۔

پودا کیڑوں کی اس عادت سے پریشان تھا کیوں کہ جس رفتار سے وہ پتے کھاتے تھے، پودے پر پتوں کے بجائے ٹہنیاں زیادہ رہ گئی تھیں۔

ایک روز پودے نے جھنجھلاتے ہوئے کہا، یہ ٹھیک ہے کہ اللہ نے مجھے تم لوگوں کی غذا کا ذریعہ بنایا ہے لیکن بندہ جسامت اور معدہ کا سائز (حجم) دیکھ کر کھانا کھاتا ہے ورنہ بدہضمی ہو جاتی ہے۔ تم لوگ ہو تو چھوٹے چھوٹے لیکن دو ہفتے اور میری شاخوں پر رہے تو میں گنجا ہو جاؤں گا۔

قریب موجود درخت پر بیٹھے طوطے نے سنا تو زور زور سے دہرایا — ٹیں ٹیں میں گنجا ہو جاؤں گا، میں گنجا ہو جاؤں گا۔

پودے پر باقی رہ جانے والے پتے ہنسے اور بولے، بھائی پودے کیوں پریشان ہوتے ہو۔ ہم غائب ہوئے تو کیا ہوا —؟ ہماری جگہ دوسرے پتے آ جائیں گے۔ بچے کھائیں گے نہیں تو جوان کس طرح ہوں گے —؟

پودا کچھ سوچتے ہوئے بولا، ٹھیک ہے کھاؤ، دل کھول کر کھاؤ۔ دل نہ بھرے تو ٹہنیاں بھی کھا جاؤ۔

طوطا بولا — دل نہ بھرے تو ٹہنیاں بھی کھا لینا۔ ٹیں ٹیں ٹیں۔ دل نہ بھرے تو ٹہنیاں بھی کھا لینا۔ طوطا ہنستا ہوا اڑ گیا۔

تتلی کے بچے یعنی ننھے منے کیڑے پتے کھا کر خوب صحت مند ہو گئے۔ توانائی (انرجی) جمع ہوئی اور ایک وقت کے بعد انہوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔ تتلی کے بچے ابتدا میں کیڑے ہوتے ہیں، انہیں caterpillar کہتے ہیں۔

بچو! کیٹر پلر کو زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونا تھا۔ قدرت کا نظام ہے کہ جو توانائی کیٹر پلر کے جسم میں محفوظ ہوتی ہے، اس سے ریشم کے تار نکلتے ہیں۔ کیڑے ریشم کے تار سے تانا بانا بنتے ہیں اور اپنے گرد لپیٹ کر اس کے اندر چھپ جاتے ہیں۔ تانے بانے سے کپڑا بنتا ہے جسے خول بھی کہتے ہیں۔

پیارے بچو! کیا آپ نے سیپی دیکھی ہے—؟ سیپی دراصل shell یا خول ہے۔ تانے بانے کا مطلب ہے کہ ایک لکیر اوپر سے نیچے اور دوسری دائیں بائیں جائے۔

زندگی کے اس دور میں داخل ہونے سے پہلے اماں تتلی نے بچوں کو بتایا کہ جو لوگ ماحول میں موجود ناپسندیدہ باتوں سے خود کو الگ رکھتے ہیں، انہیں اندر میں خوب صورت رنگ نظر آتے ہیں۔ تتلی بننے سے اڑنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ کیٹر پلر اڑ نہیں سکتا— ایک ہی شاخ سے لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

تتلی کے بچوں نے جب اماں سے اڑنے کی بات سنی تو شور مچا دیا کہ ہمیں اڑنا ہے اور آپ کی طرح رنگوں سے سجے خوب صورت پر چاہئیں۔

اماں گنگنائیں،

صبح سویرے آتی تتلی
پھول پھول پر جاتی تتلی
رنگ برنگے پنکھ سجائے
سب کے من کو بھاتی تتلی

بچوں کا تجسس بڑھ گیا۔

اماں نے کہا، اس کے لئے کسی ٹہنی سے الٹا لٹکنا ہوگا۔ بچے یک دم رک گئے اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا کہ اماں کیا کہہ رہی ہیں۔

اماں ہنستے ہوئے بولیں، کئی ہفتوں تک الٹا لٹکنا ہوگا۔ پوچھا، لیکن اماں اس سے کیا ہوگا—؟

اس سے یہ ہوگا کہ لوگوں کو جو الٹا نظر آتا ہے، آپ کو سیدھا نظر آئے گا اور جو انہیں سیدھا نظر آتا ہے، آپ جان لیں گے کہ وہ الٹا ہے۔

بچے خوشی خوشی لٹکے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے منہ سے ریشم نکلنا شروع ہوئی، جسے انہوں نے تانے بانے کی طرح اپنے گرد لپیٹنا شروع کیا۔ بچوں نے جو دیکھا، ہو بہو کیا۔ پتوں سے الٹا لٹکے ہوئے ان کیڑوں کا خول چمک دار ہرے رنگ کا تھا اور جو کیڑے شاخوں سے لٹکے ہوئے تھے ان کے

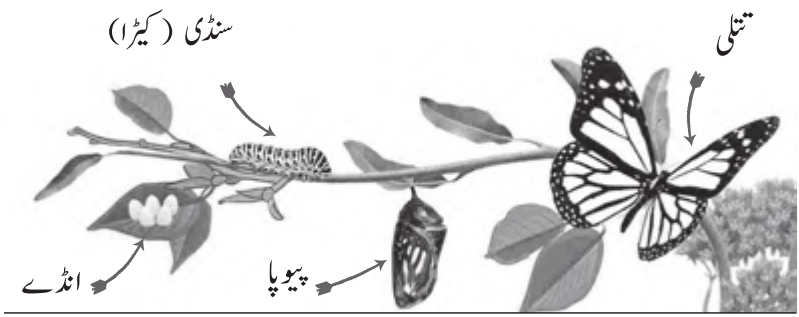

ریشم کا رنگ براؤن یا سیاہی مائل تھا۔

غور وفکر کرنے والے بچو! سوچئے ایسا کیوں ہوتا ہے—؟ جواب سمجھ میں نہ آئے تو دادی جان سے پوچھئے۔ دادی جان آپ کو بتائیں گی کہ ہرے پتے پر ہرے خول اور براؤن ٹہنی پر براؤن خول سے کیٹر پلر دوسرے جانوروں، کیڑے مکوڑے یا پرندوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

جب کیٹر پلرز کا تانا بانا سر تک پہنچا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا، بہنو اور بھائیو— جب دوبارہ ملیں گے تو ہم وہ نہیں ہوں گے جواب ہیں۔

سب مسکرا دیئے۔

بچو! خول ان کیڑوں کے لئے گھر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ننھے ننھے سوراخوں سے ہوا آتی ہے۔ سوراخوں میں خلا ہوتا ہے۔

کیڑے خول کے اندر محفوظ تھے اور خوب صورت رنگوں میں ڈھلنے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ اس دوران تکلیف کو انہوں نے صبر سے برداشت کیا۔

باغ میں مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ نظر ایک خول پر پڑی تو پہچان گیا کہ اس میں سے تتلی نکلے گی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیڑا کس طرح دل کش رنگوں کی تتلی میں ڈھلتا ہے۔ خول کو ہاتھ لگائے بغیر وہ مڑ گیا۔ البتہ باغ میں کام کرتے ہوئے دن میں کئی بار خول کو دیکھتا۔

اکیسویں دن مالی کو خول میں دراڑ نظر آئی۔ وہ جان گیا کہ خول میں چھپی ہوئی تتلی باہر نکلنے والی ہے۔ خول مزید کھلا لیکن تتلی باہر نہ آئی۔

مالی قریب گیا اور اندر جھانکا تو اسے سرخ رنگ نظر آیا۔ خول میں حرکت تیز ہوگئی، جیسے کوئی باہر آنے کی کوشش میں ہو۔ اور پھر حرکت رک گئی۔

وہ پریشان ہوا کہ کہیں تتلی مر تو نہیں گئی — ؟ اس کی مدد کرنی چاہئے ۔ تنکا لے کر خول کو کھولنے کی کوشش کی ۔ خول ٹوٹا اور تتلی باہر آ گئی ۔

مگر یہ کیا — اس کا جسم تو سوجا ہوا ہے اور یہ اڑنے کے بجائے رینگ کیوں رہی ہے — ؟ مالی نے خود سے کہا۔

تتلی نے پر پھڑ پھڑانے کی کوشش کی لیکن اڑ نہ سکی ۔ مالی نے سوچا کہ سوجن ختم ہوتے ہی اڑنے لگے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بہت کم زور تھی ۔

تتلی کی عمر ہفتوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن کم زور جسم کے ساتھ وہ زندہ نہ رہ سکی ۔ مالی کو بہت افسوس ہوا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی نیکی نے تتلی کی جان لے لی اور وہ صرف دو دن زندہ رہ سکی ۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ تتلی کی زندگی کا مالی کی مدد سے کیا تعلق ہے۔

تتلی جب خول سے نکلنے کے لئے زور لگاتی ہے تو طاقت کے استعمال سے جسم میں سے ایک مادہ خارج ہوتا ہے جس کی مدد سے تتلی کے پر پھیلتے ہیں اور وہ اڑنے کے قابل ہوتی ہے ۔ چوں کہ تتلی کے بجائے مالی نے اس کا خول کھول دیا تو تتلی کے جسم سے مادہ نہیں نکلا اور وہ کم زور پیدا ہوئی ۔

دوسری تتلیاں اپنا خول خود توڑ کر باہر آئیں، ان کے پر مضبوط تھے ۔

کیڑے سے تتلی بننا آسان نہیں — محنت، صبر، تکلیف اور برداشت سے گزرنا ہوتا ہے ۔ ابھی وہ پوری طرح اڑنے کے قابل نہیں ہوئی تھی کہ مالی کے تجسس نے اس کے خول کو کھول دیا ۔ تتلی وقت سے پہلے خول سے باہر آنا برداشت نہیں کر سکی اور مر گئی ۔ اگر وہ اپنی محنت سے باہر آتی تو دو ہفتوں تک زندہ رہ سکتی تھی ۔

کہانی میں سبق یہ ہے کہ وقت سے پہلے کوئی چیز دے دی جائے تو آدمی اس کا بوجھ برداشت نہیں کرتا ۔ وقت گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ یا بڑے کے اندر اتنی سکت پیدا کی جائے کہ وہ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکے ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے نظام میں ہر چیز کا وقت معین ہے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔''

(سورۃ البقرۃ، آیت:249)

خواب تعبیر اور مشورہ

ہادی امم ـــ رحمۃ للعالمینؐ

فوزیہ عالم، فیصل آباد۔ دو مہینے سے بیٹی کا بخار اتر نہیں رہا تھا۔ پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اسی عالم میں خواب دیکھا کہ ہادی امم رحمۃ للعالمین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور فرمایا کہ حدیبیہ کے کنوئیں کا پانی پلاؤ۔ فوراً خیال آیا کہ یہ پانی تو میرے پاس ہے۔ صبح بیٹی کو وہ پانی پلایا۔ اللہ کا شکر ہے اب بیٹی ٹھیک ہے۔

تعبیر: خواب مبارک ہے۔ ہم سب اس سعادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ آپ درود شریف کا معمول جاری رکھیں۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

کی فلک نے ماہِ آسماں پہ محبتوں کی بارش

محمد سلیم، کورنگی۔ استادِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا، حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ ـــ ''کی فلک نے ماہِ آسماں پہ محبتوں کی بارش'' جاگنے کے بعد بیگم صاحبہ کو یہ شعر لکھوانا شروع کیا۔ پہلے مصرع کے بعد برابر میں سوتے ہوئے بھائی کی کہنی کئی بار مجھے لگی اور شعر کا دوسرا مصرع ذہن میں نہیں رہا۔

تعبیر: ابدالِ حق قلندر باباؒ کے فرمان پر غور و فکر کیجئے، انشاءاللہ روزن کھلے گا۔

غور کیجئے

ا، ب۔ والدہ نے خواب دیکھا کہ امی اور خالہ کسی کے ساتھ میلی کتھئی رنگ کی گاڑی میں جارہی ہیں۔ یہ گاڑی کسی اور ملک سے آئی ہے۔ گاڑی میں مسئلہ ہونے کی وجہ سے اسے روکنا پڑ گیا۔ خواب یک رنگ اور دھندلا تھا۔ پھر دیکھا کہ وہ لوگ بازار میں موسمیاں ڈھونڈ رہے تھے کہ وہاں لڑائی شروع ہوگئی۔ ان باتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا۔

تعبیر: آپ کے ذہن میں جو مطالبہ ہے اس میں منفیت زیادہ ہے۔ یہ بات جو میں لکھ رہا ہوں غور سے پڑھئے۔

ایک جہاں نہیں انسانی شماریات سے بہت زیادہ اللہ کی قدرت سے جہاں آباد ہیں۔ جب ہم اپنی زمین پر غور کرتے ہیں تو آبادِ مخلوق کی تعداد کسی بھی طرح شماریات میں نہیں آتی۔ ارب، کھرب، سنکھ، سب ایک سمت میں بیٹھے ہوئے اس معاملہ میں بے زبان ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے سارے سمندر اور لاشمار درخت ـــ اگر زمین پر تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں، سب ختم ہوجائیں گے، اللہ

کی باتیں کسی بھی طرح شماریات کے دائرہ میں بیان نہیں ہوسکتیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنی مخلوق کو رزق عطا فرماتے ہیں۔ مخلوق سمندر کی ہو، زمین کے اوپر یا اندر ہو، چوپائے ہوں، پرندے ہوں، چیونٹیاں ہوں، حشرات الارض میں ذیلی مخلوقات کیڑے مکوڑے، بیکٹیریا، وائرس اور وہ مخلوق جس سے نوع آدم واقف نہیں ہے، سب پیدا ہوتے ہیں، سب خوراک، پانی، ہوا، آکسیجن کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ لاشمار جانوں کو یعنی مخلوقات کو رزق عطا فرماتے ہیں۔ اپنے خواب پر غور کیجئے۔

تعبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ رزق کی فراوانی کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک بستی سے دوسری بستی میں منتقل ہونا چاہتا ہے جب کہ یہ عمل جوانی یا جوانی کے بعد شروع ہوتا ہے۔

دنیا میں جس خطہ پر بھی مخلوقات آباد ہیں، اللہ تعالیٰ بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ ہر بندہ بشر اس بات کا تجربہ رکھتا ہے کہ نو مہینے رزق کا وسیلہ ماں بنتی ہے۔ عالم اسباب دنیا میں آنے کے بعد بھی سوا دو سال تک یعنی تین سال، اور بلوغت تک، رزق اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور وسیلہ والدین بنتے ہیں۔

ش، ا، کراچی۔ تعبیر: خواب کی تعبیر یہ ہے کہ آپ برائی کے خلاف جہاد (کوشش) کریں اور صراط مستقیم پر قائم رہیں۔

غیب ــــ ظاہر ــــ غیب

اظہر اقبال، کوٹ ادّو۔ بھائی ایک پودا لاکر کہتا ہے، اماں سے پوچھیں کہ پودا کہاں لگانا ہے۔ والدہ کے انتقال کو دس ماہ ہوگئے ہیں۔ میں والدہ کے کہنے پر بڑے بھائی کے صحن میں گہرا گڑھا کھودتا ہوں تو نیچے لکڑی کے پھٹے ہوتے ہیں۔ ان پر مٹی ڈال کر پودا لگایا اور اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ اتنے میں باجی آئیں تو ان کو پودا دکھاتا ہوں۔ وہ کپڑا ہٹاتی ہیں تو پودے کے ساتھ مرحومہ والدہ لیٹی ہیں جن کی آنکھوں پر روشنی پڑنے سے وہ آنکھیں کھول دیتی ہیں۔

باجی پوچھتی ہیں، اماں آپ کچھ کھاتی پیتی ہیں ــــ؟ والدہ کہتی ہیں مجھے پیاس لگی ہے پانی پلا دو، میں کچھ کھا پی نہیں سکتی کیوں کہ منہ میں دانت نہیں ہیں۔

تعبیر: کھانوں میں نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اعتدال پر قائم کی ہے۔ ہر مخلوق ایک دوسرے کو جانتی ہے۔ ہر مخلوق ماں باپ بنتی ہے اور ہر مخلوق کی ضروریات زندگی مشترک ہیں۔ آدمی، چوپائے، پرندے، شجر و حجر سب پیدا ہوتے ہیں اور سب جوان ہونے کے بعد بوڑھے ہوتے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں لیکن تفکر بتاتا ہے کہ مخلوق چھپی ہوئی ہے۔ مخلوق ظاہر ہوتی ہے۔

زندگی کے تین دنوں کا حساب اگر لگایا جائے پہلا دن غائب ہے، دوسرا دن ظاہر ہے، تیسرا دن پھر غائب ہے۔ بچپن غیب میں چھپ جاتا ہے اور غیب

جوانی میں چھپ جاتا ہے۔ جوانی بڑھاپے میں چھپ جاتی ہے اور بڑھاپا غیب بن جاتا ہے۔

یہ بات اس طرح آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ زید کا وجود سامنے نہیں یعنی وہ غیب میں ہے۔ غیب جوانی کا روپ دھار لیتا ہے اور جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ پیدائش سے پہلے ہر شے غیب ہے۔ پیدائش کے بعد ہر شے حاضر ہے۔ حاضر شے پھر غیب ہے۔ یہ ایک بیلٹ ہے جس پر زندگی رواں دواں ہے۔

دولفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ غیب ۲۔ ظاہر ۳۔ غیب

ظاہر غیب، غیب ظاہر ـــ معلوم نہیں ظاہر کیا ہے، نہیں جانتے غیب کیا ہے۔

	غیب	ظاہر	غیب
پہلا دن —>	0 —	x —	0
دوسرا دن —>	0 —	x —	0
تیسرا دن —>	0 —	x —	0

فرج میں رکھی چیزوں سے پرہیز

نام شائع نہ کریں، کراچی۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں، مرحوم بہنوئی نظر آئے۔ وہ ادب سے سلام کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا مجھے لینے آئے ہیں مگر وہ جواب نہیں دیتے۔

جب تین سے چار دفعہ پوچھتا ہوں تو الگ لے جا کر کہتے ہیں کہ ہاں تمہیں لینے آیا ہوں۔

پھر ایک خاص نشست سے بٹھا کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد کہنے لگے، میں یہ سوچتا ہوں کہ ابھی تو مجھے لوگوں کا قرض بھی واپس کرنا ہے۔

پھر دیکھا کہ ایک کتا بڑے پیار سے میرا ہاتھ اپنے منہ میں لے لیتا ہے۔ باہر ایک کتیا آدمی نما شکل میں کھڑی ہے، سوچ رہا ہوں کہ باہر گیا تو میرے ساتھ آجائے گی۔

تعبیر: بدپرہیزی کے خاکے زیادہ ہیں۔ کھانے میں بے اعتدالی خصوصاً فرج میں رکھی ہوئی چیزوں سے پرہیز ضروری ہے۔ خواب کے تمثلات بخار کی طرف اشارہ کررہے ہیں، اس کی وجہ بدپرہیزی ہے۔ طبیعت میں اعتدال نہیں ہے۔

معاش میں مستقل مزاجی ضروری ہے۔

معتصم خان، پنڈی۔ **تعبیر:** الحمدللہ آپ کا خواب مبارک ہے۔ خواب میں نشان دہی ہے کہ جو کچھ ذہن نے دیکھا اور آپ نے اس کے معنی سمجھے اس میں آپ کے خیالات کی عکاسی زیادہ ہے۔ یقیناً آپ نے کسی وقت خواب کی تعبیر میں کوئی واقعہ پڑھا ہے جس کے نقوش آپ کے ذہن میں محفوظ رہ گئے اور وہ نقوش منتقل ہوگئے۔ ہم سب کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ہر بندہ بشر کے ساتھ اللہ کا نافرمان بغاوت کرنے والا موجود رہتا ہے۔ اس کا بنیادی کام آدم زاد کے اندر شک پیدا کرنا ہے، اس طرح کہ آدمی شک کو یقین سمجھتا ہے اور بسا اوقات یقین کو شک کی

عینک سے دیکھتا ہے۔

جو خواب آپ نے دیکھا ہے ہم اس کو شائع نہیں کررہے اس لئے کہ شک اور یقین کبھی دونوں یک جان نہیں ہوتے اور نہیں ہو سکتے۔ البتہ آدمی اگر یقین اور شک دونوں میں سے شک کو قبول کرلے تو پھر صراط مستقیم سے نظر ہٹ جاتی ہے۔

قرآن کریم میں سورہ بقرہ کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان عالمین کے لئے کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے، ذٰلک الکتاب ، یہ کتاب، لاریب فیہ، اس کتاب میں شک نہیں ہے۔ اور جن لوگوں میں شک نہیں ہے ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے، ھدی للمتقین، متقی خواتین وحضرات یقین کے درجہ پر فائز ہیں۔

وظیفہ

ب، ج، کراچی۔ بھائی کے ساتھ بازار سے گزر کر آگے گئی تو سفید لباس میں نورانی صورت شخصیت کو دیکھا۔ سفید لباس پہنے دو افراد ان صاحب کے پیچھے باادب آرہے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی بزرگ ہیں جو اپنے خلفا کے ساتھ تشریف لے جارہے ہیں۔

پھر دیکھا کہ جو شخص ان صاحب کو دیکھتا ہے وہ مصافحہ کرکے ان کے ساتھ چلنا شروع کردیتا ہے۔ ہم وہیں کھڑے ہیں۔ جب بزرگ ہمارے قریب تشریف لاتے ہیں تو بھائی کو گلے لگاتے ہیں اور مجھے دعا دے کر غائب ہوجاتے ہیں۔ میں حیرت سے سوچ رہی ہوں کہ ابھی تو یہاں تھے اب کہاں چلے گئے۔ اسی سوچ بچار میں ایک رشتہ دار کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں ایک قبرستان ہے جس میں قبریں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ پھر کچھ لوگوں کو نماز کی تیاری کرتے دیکھا۔ میں وضو کرکے ایصال ثواب کے لئے آیت الکرسی پڑھتی ہوں جس کے فوراً بعد آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: خواب دیکھنے والی صاحبہ نے ایک عرصہ پہلے کوئی وظیفہ شروع کرکے اسے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وظیفہ کا خیال بھی بھول کے خانہ میں چلا گیا۔ دوبارہ سے وظیفہ شروع کرکے مکمل کردیجئے، انشاء اللہ کامیابی و بہتری کی صورتیں سامنے آجائیں گی۔

تجزیہ: نورانی صورت بزرگ اور ان کے دو خلفا سے مراد تسبیح کا امام اور شمار کے لئے نائب امام ہیں۔ تسبیح کے دانے چھوٹی چھوٹی قبروں کی صورت میں نظر آئے۔ وضو اور آیت الکرسی پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس وظیفہ کو پورا کردیں گی۔ ایصال ثواب وہ کامیابی ہے جو اس وظیفہ کو پورا کرنے کے بعد سامنے آئے گی۔

سیر و تفریح

نام و پتہ شائع نہ کریں۔ خواب میں رشتہ داروں سے ملنے لاہور پہنچی۔ خیال آیا پہلے داتا دربار جاؤں۔ وہاں مسجد میں مصلّے پر سر رکھتی ہوں تو سورہ یٰسٓ کی تلاوت سنائی دی۔ واپس جاتے ہوئے خیال آیا کہ دربار پر

دوبارہ حاضری دوں۔ دیکھا کہ لنگر تقسیم ہورہا ہے جس کے لئے لائن لگی ہے۔ جب میری باری آئی تو لنگر تقسیم کرنے والا ڈانٹ کر کہتا ہے کہ پہلے امی جان سے معافی مانگو۔ میں خاموشی سے دربار کے اندر جاتی ہوں تو دیکھا کہ کرسی پر کوئی موجود ہے۔ مجھے بہت رونا آتا ہے جس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: سیر وتفریح کی باتیں ذہن میں آئیں، فلم بن کر خواب میں نظر آگئیں۔

موبائل فون

محمد آصف، کورنگی۔ دیکھا ایک بڑے عہدہ دار تشریف لائے جنہیں صوفے پر بٹھایا۔ ہم جماعت زمین پر بیٹھا تھا اس نے اپنا موبائل فون مجھے دیا پھر میں مٹی کے ٹیلے کے پاس سے گزرا، دیکھا کسی چاردیواری میں کھڑا ہوں وہاں ہم جماعت کی والدہ آگئیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ فون اسے ہی دوں گا اسے بھیجئے۔ اچانک لگا کہ قیامت آگئی، کانوں میں صور کی آواز آئی اور میں لیٹ گیا مگر بے چینی سے کروٹ بدلتا رہا۔

تعبیر: اچھا لٹریچر پڑھا کریں۔ حضور پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پڑھ کر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ پانچ وقت نماز کی پابندی کریں اور رکعتوں میں پڑھنے کے لئے تیسویں پارہ کی چھوٹی سورتیں ترجمہ کے ساتھ تلاوت کریں۔

ماہنامہ قلندر شعور فروری 2019

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:..... والدہ صاحبہ کا نام:.....

پورا پتہ:.....

ازدواجی حیثیت:.....وزن (تقریباً):.....آنکھوں کا رنگ.....

نیند کیسی آتی ہے:.....بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):..... تاریخ پیدائش:.....

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.....فون نمبر.....

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات :.....

.....

یک در گیر و محکم بگیر

نام شائع نہ کریں۔ خواب دیکھا کہ مراقبہ میں خالی الذہن ہوں۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب نمودار ہوئے اور ساتھ ہی ذہن میں ملاء اعلیٰ کے نام آنے لگے۔ وہ صاحب قریب آکر کہتے ہیں کہ کیا حضورؐ کی زیارت کرنی ہے؟ میں جی کہتا ہوں تو خوب صورت باغ نظر میں سے گزرنے لگے۔ خیال آیا کہ یہ تو وہ نہیں جو کہا ہے۔ یہی بات جب ان صاحب سے کہی تو وہ کہتے ہیں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نماز کے لئے مسجد آتا ہوں جہاں کافی لوگ ہیں۔ وضو کر کے ایک کونے میں کھڑا ہوا تو محسوس ہوا کہ وہاں کوئی ہے۔ وہ دوست ہیں جو مجھے دیکھ کر جگہ دیتے ہیں اور نماز کے بعد پاس بٹھا کر باتیں کرتے ہیں جب کہ میرا دل پہلے والے صاحب کی طرف کھنچ رہا ہے۔

تعبیر: یک در گیر و محکم بگیر، یہی آپ کے خواب کی تعبیر ہے۔

ب، ا، لاہور۔ **تعبیر۔** ذہن میں گشت کرنے والے خیالات فلم بن کر سامنے آ گئے۔ ان خیالات میں مبالغہ آرائی کا غلبہ ہے۔ یہ عادت عملی زندگی میں رکاوٹ بن کر سامنے آتی ہے، اسے قطعی طور پر ترک کر دینا چاہئے تاکہ پشیمانیوں کا اعادہ نہ ہو۔

جادو کا توڑ

زیادہ تر حالات میں جادو کا خیال وسوسہ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن جادو سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جادو ایک علم ہے جو قرآن پاک سے ثابت ہے۔ فی الواقع اگر کسی شخص پر جادو کا اثر ہو اور کوئی جاننے والا اس کی تصدیق بھی کر دے کہ جادو کیا گیا ہے تب یہ علاج کیا جائے۔

صبح بہت سویرے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھے اور سورہ قل اَعوذ برب الفلق پڑھتے پڑھتے سمندر، دریا یا ندی پار کر لے۔ دوران سفر بات کرنا منع ہے۔ ندی یا دریا پار کرنے کے بعد پانی کے کنارے مشرق کے رخ منہ کر کے اکڑوں بیٹھ جائے اور انگشت شہادت سے

هَا مَا نْ هَارُوْتْ مَا رُوْت

لکھ کر ہاتھ سے مٹا دے۔

لکھنے اور مٹانے کا یہ عمل ہر حال میں سورج نکلنے سے پہلے کیا جائے۔

کسی جگہ اگر سمندر یا دریا نہ ہو تو وہاں آبادی سے باہر کنوئیں کے پانی میں اپنے چہرہ کا عکس دیکھے۔

but it is nothing short of carnivorous wolf, awaiting its prey to devour."

The Hoopoe replied, "It is not just you but every bird that is trapped by it. You all have befriended this beast and it too is doing justice to this friendship by plunging you in filth. The ego is not to be trusted for it deceives and lies. It is deaf and blind. When you are falsely praised, it inflates so much that it becomes difficult for it to contain.

It was an infant, and you fed it and nurtured it into a strong being. It now controls you and you follow its commands. It has made you blind. It is the one who sees while you boast around. You don't hear it, but it does. *Nafs al-Ammarah* is like a young, agile dog who has now stepped into old age. Why will it mend its ways? People die fulfilling the ego's undue wishes, but it lives on."

"Once, I asked an old man whose profession was to dig and bury dead bodies in graves about any strange occurrences that had happened during his life while carrying out his duty. Do you know what he said?

He answered, 'My *nafs* is a witness of burying the dead in their graves, but never once in seventy years did it turn towards God.'"

(Episode 7)

Hazrat Shah Kaleemullah Shah Jahanabadi Chishti (RA) says:

* The most important duty of people seeking the cognition of God is to follow the life of Prophet Muhammad (PBUH). There is no better method to self-purification.

* God does whatever He plans and whatever He wills. Do not consider anyone to be His partner.

* Do not procrastinate to repent or to mend your ways. Consider repentance to be obligatory on yourself, day and night.

* A good quality of a friend is to desire for others what they desire for oneself and one should not be jealous of others for what they possess.

* One should tolerate the unfaithfulness of others, remember their good deeds instead, and forget their own good deeds.

* People who are not particular about 'time', lose in this world and the hereafter too.

* Sincerity and love in prayers brings one close to God and insincerity or hypocrisy in prayers takes one farther away from God.

* Stay in the bounds of obedience defined by God.

marks the end of the seventh heaven), the Archangel Gabriel heard the voice of God, "*Labbaik* (I am here)."

Gabriel figured that someone was calling God and in response, God was saying "*Labbaik,*" but Gabriel could not find who was calling God.

He looked around in every nook and corner of the seven skies and earth, searched through the beds of rivers and oceans, traversed the deserts, mountains and jungles but did not succeed.

When Gabriel returned, he could still hear echoes of "*Labbaik*". Inquisitive, he requested God to show him the blessed person to whom He was responding to.

God replied, "Go to Rome. There in a temple you will find that man."

He went there immediately and saw that a man was weeping and calling to an idol earnestly. Confused, Gabriel said, "O God! You are blessing he who calls an idol instead of you. What secret lies in this matter?"

God unveiled the mystery and said, "O' Gabriel! His heart was bleak and the course he had taken was wrong, and yet I liked his humility. I am the true Creator. He does not know me but I know that he has gone astray due to negligence, therefore, due to his humility, I helped him and showed him the right path.

He is forgiven. He has seen the right course, and that's why, instead of the idols he is calling for God. I love those who are humble and meek. Thus, remain humble and be hopeful for God's mercy."

A bird from the first queue said, "I would have been a gem, had I not been made the transgender. My condition changes with the passing of time. From the state of non-existence, I come into existence and my existence turns into nonexistence. At times my *nafs* indulges me in worldly pleasures but my soul guides me to worship. I am perplexed and looking for a way out from this dual state."

Hoopoe said, "O' puzzled one! Each living being is established upon two facets. One side is dominant at times and sometimes the other. The fortunate ones are free of those facets despite living in the duality. What was the need of messengers, had all beings been pious and pure? You have always nourished your ego, and that is why you are lying in the pits of ignorance. To see the transformation in yourself, bow before God in humility and you will witness how you turn into a diamond from coal."

One of the birds then asked about the *Nafs al-Ammarah* (self that is inclined to evil).

He said, "My *nafs* robs me. I am not sure how to get rid of it. On the surface, it looks beautiful,

*maleun (*maledict). This certainly does not mean that one should not worship the Lord.

Anyone who says such a misleading thing is doomed to be cursed. Even for a moment, do not quit worshipping. Just make sure that you do not believe that your worship makes you superior, as ideas such as that sprout pride. Billions of years of worship cannot equal the reverence that mighty, magnificent being is deserving of.

A moment of self-gratification can wash away a life's worth of worship. It is our necessity to worship and obey Him but never depend on it, depend only on the graciousness of God. It will not be your worship that saves you, but His mercy. The one who trusts in His mercy will prosper. It is not possible to cross the path of *Sulook* without the guidance of a *Kamil Murshid* (a perfect spiritual master). Those who hold the hand of their *murshid* firmly always pass through the path, and with their guidance, never tumble."

Another bird came close to the pulpit and said, "I will die crying if I continue to travel."

To which Hoopoe said, "Don't wear yourself down by crying. Life here is short. One has to return to the final abode, be it young or old. Many people who indulged in the love of the world are now neither fish nor flesh. Why must we bring shame to ourselves when eventually we must embrace death? Since death is imminent, why not die fulfilling a great cause? He knows whether we will reach there or not, but the fact of the matter is that whether or not we die on this path, it will still lead to Him.

My dear grief-stricken friend! The material world is a corpse and those seeking it are scavengers. It is better to die than to lead such a life. There is an eternal life after this kind of death. My dear! How can you reach the exalted position unless you become a true lover like Hazrat Rabia Basri (RA)? You just need to become a lover – it is his discretion to decide whether or not to accept it. Some attain their desires in the Kaaba while find it with the secrets in the temples. Prophet Abraham (PBUH) attained the exalted position by destroying the idols, hence, you must shatter the idol that is your *nafs* (ego) into pieces and follow in his footsteps."

One more bird stepped forward and said, "I am a transgressor. Do you think I deserve to witness Simurgh?

Hoopoe answered, "The court of king is the court of mercy. Seek forgiveness now, and you will be freed from the stains of the past in the present. Even if you have sinned hundreds of times, beg forgiveness hundreds of times. That magnificent being always forgives."

One night, while in *Sidrat al-Muntaha* (The Lote tree that

and esteemed court of God demands pure love. When at my command, the *Noor* (a stage of Divine light) is descended on earth, the ones in deep slumber, away from the remembrance of God, are deprived of it. People wait for years and years, and then only one out of many is allowed to enter the honourable court of God."

The birds were struck with awe by the mysterious silence of the path before them. There was no extremity in the course they were travelling on.

The level of Simurgh's magnificence could be witnessed through the fact that everything from the earth to sky bowed in reverence. Nothing in the wilderness had any worth. The birds had set down to rest again and addressed Hoopoe after consulting each other, "O' knower of the path! You have spent a long time with King Solomon (PBUH), thus, you have experienced dangers and ease, and are aware of the norms of the kingdom.

The ups and downs of a path are not unusual for you. You have trudged on these paths undoubtedly, not once, but many times. You are aware of the etiquettes and reverence it demands and deserves. We, on the contrary, have feeble hearts and are not aware of the reality of the path. This long distance can not be travelled with ignorance and we do not want to be disrespectful before the king. Therefore, O' guide of ours! Please come up on the pulpit and educate us on the path and its etiquettes. Each one of us has a different idea of what it should be. To strengthen us in our convictions, it is necessary for the heart to be devoid of doubts, therefore, kindly answer our queries. We will traverse courageously with contented hearts."

Hoopoe took the pulpit and glanced at the convoy. There was a sea of *Salikeen* (travelers on the path of spirituality), standing in queues one after the other.

The Nightingale and the Dove stepped forward and through their melodious voices, stirred ecstasy within the audience. After they finished, Hoopoe began his sermon and unveiled the esoteric secrets.

One of the birds asked Hoopoe, "You are a bird like us but you are superior. What has earned you this exalted position?"

He replied, "O' bird! I have not attained this position in exchange for silver, gold or prayers. All of this fortune is due to that one moment where King Solomon's (PBUH) sight fell upon me.

Material possessions or acts of worship do not give you superiority. Even Satan worshipped a lot but his one act of disobedience washed away all of his good deeds and he was pronounced

The Diary of Birds

Summary of the Previous Episodes: Mantiq-al-Tayr (The Diary of Birds) is a marvel, authored by the pen of Hazrat Farid al-Din Attar (RA), who has beautifully presented the knowledge of tasawwuf and True love figuratively in the garb of birds. Through the narrations of the attributes of birds, Attar's (RA) aim is to have the creations look for their Creator, which is only possible when we destroy our "ego", and let our intellect follow the True Reality. The Hoopoe comes forward as a messenger of the birds who introduces them to King Simurgh, by telling them of his magnificent attributes. The birds become restless in wanting to meet Simurgh and with the leadership of the Hoopoe, begin their journey. Since the journey is uneven and long, the birds become perturbed. Each of them tries to give up and narrates an excuse, but the Hoopoe tries to convince them that their pretext is weak. During the journey, when the birds set down to rest, they asked Hoopoe about their affiliation with Simurgh. Hearing the answer, the vigor to reach that high station developed within them. Hoopoe tells them of the variable nature of the world, and the consistency of the nature of the king and his relation with birds. After knowing the truth, the birds began their journey with zeal and zest. Journeying through the turbulent paths, they see the first valley of Sulook (the path of spirituality). Read more ...

One of the *Salik* (traveler on the path of spirituality) asked Hoopoe, "No life seems to exist on this pathway. Why it looks so vacant?"

He replied, "This way leads to the Simurgh. What you consider to be nonliving has a life in it too, therefore they exist. Had there been no life, they would not have existed. These tall peaks, red, black, and lush green mountains, and deep blue seas are all aware of the significance of this path. Therefore, they are tranquil and quiet."

Hoopoe told the birds that one night a well-known Sufi Master called Bayazid Bastami (RA) stepped out of town. The night was dark and engulfed in a deep silence. The stars had covered the sky and their dim lights were descending and illuminating the earth. People on earth were fast asleep but the inhabitants of the sky were carrying out their duties diligently. Sufi Bayazid Bastami (RA) surveyed the jungle in the desert but felt no movement there.

He asked God, "Dear God, do I not see anyone passionate in your court?"

A voice came from the world unseen, "O' surprised one! Not everyone is allowed in the august court of the sovereign God. Entering into the highly magnificent

The Formula of Time and Space

Prophet Solomon (PBUH) learned that the Queen of Saba was to arrive. He addressed the courtiers, "I want the throne of the queen to be present here before she arrives."

One of the Jinn, *Efreet*, said, "I can get it here before the court is adjourned."

Upon hearing this claim, a human being, Asif Bin Burkhiya, said, "I have the knowledge of the book of God. I can present the royal throne before you can blink." As soon as Prophet Solomon (PBUH) blinked, the throne appeared in his court.

Prophet Solomon (PBUH) ordered that the appearance of the throne be altered and said, "I would like to see whether she takes to the true course after seeing this."

When the Queen of Saba arrived before Prophet Solomon (PBUH), she was asked, "Is your throne like this?"

She answered, "It does seem like mine. I am aware of your unrivalled and unparalleled power, henceforth, I have come here to submit before you in obedience. This strange experience of my throne being present here is an exhibition of your unmatchable powers, which has necessitated that I express my obedience before you."

(Episode 2)

The Hoopoe is a medium sized colourful bird that stands out for its distinctive 'crown' of feather. It is named after the sound it produces - oop-oop-oop.

Hoopoes have the ability to detect water in the ground, and indicate where to build a well.

They do not build typical nests, instead they look for cavities in tree trunks, cliffs and walls. Females stay inside the nest until the eggs hatch, and males feed the females during this time. In order to hide from predators, they close up the nest as much as possible, leaving an opening for male bird to bring food. Females and youngs also have the ability to secrete a stinky odor to ward off predators.

The long, and strong bill of hoopoe helps it to dig into the ground to find insects to eat, and also likes to forage on plant matter which includes seeds and berries etc. Hoopoe requires cooler climate for breeding. Their average lifespan in the wild is 10 years.

have brought news that you are not aware of. There lives a Queen of Saba in the region of Yemen. God has provisioned her with everything. Her kingdom has a magnificent army, but the queen and her subjects worship the sun. Satan has led them astray and they do not worship the One and Only Lord, who has no partner."

Qarib was the capital of Saba. The natives built barriers on streams for irrigation purposes. The biggest dam in the capital was known as 'Sadd-e-Qarib' with gardens of fragrant flowers and orchards on both sides. The nation of Saba was rich and trading was their occupation. They committed idolatry and bowed before the sun as their greatest god.

After the Hoopoe had narrated his excuse for absence, Prophet Solomon (PBUH) said, "It shall be proven now whether you are lying or telling the truth. If you are truthful, take my letter to the people of Saba, and wait there for what they converse about it."

The Hoopoe flew off for Saba with the letter and upon reaching there, saw that the Queen of Saba was on her way to worship the sun. He dropped the letter before her. She picked up the letter and read it and then spoke to her courtiers, reading the contents of the letter aloud:

"This letter is from Solomon, and it begins with the name of God, The Most Beneficent, The Most Merciful – you should not express rebelliousness and grandeur before us. Come to me in obedience of God Almighty."

After reading the letter, the queen said, "O chiefs! You are all aware that I do not take any step on important affairs of the kingdom prior to consulting you all. Therefore, advise me what should I do?"

They said, "There is no need to be influenced by the letter as we are powerful and own many weapons. As for our advice, you may decide according to your wish. We are obedient to you."

The queen said, "The manner in which we have received the letter of Solomon demands that we take a prudent step. I intend to send an envoy to him with expensive gifts."

When the envoy presented the gifts before Prophet Solomon (PBUH), he said, "Take these gifts away and tell the queen that if she does not accept my message, Solomon's magnificent army will raid Saba, and she will not be able to stand against our might."

Upon the envoy's return, they told her of the magnificence and grandeur of the court of King Solomon (PBUH), and that not only humans, but jinn and animals were also subservient to him. She decided to present herself before him in obedience and set off for the journey.

the beds of the oceans. 684 decorated pillars were built in the mosque which was 784 yards long and 455 yards wide. 4000 lanterns used to be lit and 700 cleaners would clean the floor.

Prophet Solomon (PBUH) was blessed with the wisdom to understand the language of animals. Once he was travelling somewhere with his grand entourage of jinn, humans and animals. Even with such a varied army, no one dared to budge from their allocated position and rank to commit disturbance. The obedient army was marching in order, under the influence of the might of Prophet Solomon (PBUH).

The Wisdom of the Queen Ant

The army reached a valley that was inhabited by ants. Seeing that, the queen of the ants Shah Moor ordered her subordinates, "Immediately enter in your dwellings. Solomon and his army have no clue of you moving about in the valley in such a large number. No one knows how many of you may get trampled under the feet of horses and his army unknowingly."

In the Holy Quran, it says, "Surely We gave knowledge to David and Solomon, and they said, 'Praise belongs to God who made us excel many of His believing servants.' And Solomon was David's heir, and he said, 'O people we have been taught the speech of birds, and all sorts of things are given to us. Indeed, this is the evident Grace. And mustered for Solomon were his forces from among the Jinn and humans and the birds. So, all of them were kept under control, until when they reached the valley of the ants, one of them said, 'O ants, enter your dwelling places, lest Solomon and his army crush you unknowingly.' So he smiled, laughing on her speech and said, 'My Lord, enable me to become grateful to Your favour that you have bestowed on me and on my parents, and to do good deeds that You like, and admit me, with your mercy, among your righteous servants." (Quran, 27:15-19)

Prophet Solomon (PBUH) placed that ant on his palm and asked, "Tell me, is your kingdom greater, or mine?"

The queen ant replied, "God knows whose kingdom is magnificent. But at the present moment, Solomon's hand is my throne."

The Hoopoe Bird

The court of Prophet Solomon (PBUH) was once set with all its magnificence. Seeing the Hoopoe absent, Prophet Solomon (PBUH) said, "I do not see Hoopoe? Is he really absent? I will punish him severely, or execute him unless he comes up with a reasonable excuse for his absence."

It was not long before the Hoopoe arrived. On Prophet Solomon's (PBUH) inquiry, he said, "I

Prophet Solomon (PBUH)

"Immediately enter in your dwellings. Solomon and his army have no clue of you moving about in the valley in such a large number. No one knows how many of you may get trampled under the feet of horses and his army unknowingly."

Al-Aqsa Mosque

As per the will of Prophet David (PBUH), Prophet Solomon (PBUH) planned to develop a huge city around the mosque and rebuild it from scratch. He had a desire to use precious stones to decorate the mosque and the city. He commanded his subjects to bring huge, beautiful stones from distant lands, which was a job carried out by Jinn. The mosque was built with these giant, precious stones that the Jinn brought in. A platform was constructed to keep the Ark of Covenant, which was 20 cubits in length and width and 20 cubits high. It took nearly seven and a half years to complete the building.

"They used to make for him whatever he wished of castles, images, basins as tanks, and big cookware fixed. 'Do good, O family of David, in thankfulness. Very few from my slaves are thankful.'" (Quran, 34:13)

For cooking langar, cauldrons were as large as a pond.

Some other buildings were built by Jinn in the time of Prophet Solomon (PBUH). They also made some wonderful things which were considered extraordinary at that time.

"And from the devils, those who dived in water for him and did jobs other than that. And We were the One who kept watch over them." (Quran, 21:82)

"And there were some Jinn who worked before him with the leave of his Lord. Whoever of them would deviate from Our command, We would make him taste the punishment of the blazing fire." (Quran, 34:12)

"And mustered for Solomon were his forces from among the Jinn and the humans and the birds. So, all of them were kept under control." (Quran, 27:17)

Thirty Thousand Labourers

About 30,000 workers constructed the Al-Aqsa Mosque. Galleries and corridors were built from pinewood. The platform used for the Ark of Covenant was built using sandalwood. Thousands of people were appointed to cut stones from mountains and 100,000 carvers would carve the stones into beautiful shapes and designs. Thousands of elephants and camels were involved in transporting stones. There were many Jinn appointed to fetch gemstones such as ruby, beryl, turquoise and even pearls from

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

happiness, remorse, pain, anger, kindness, enviousness, or gratitude for instance. A human being cannot be considered as an end product of aforementioned constituents. One may raise many questions on told stoichiometry of typical human being, such as:

- Whether an instance is experienced by the constituent element Carbon?
- Whether Nitrogen expressed pleasure, as 'a nice weather'?
- Whether a Phosphorus intended to assist other Phosphorous?
- Would anyone consider a human being merely an outcome of stoichiometry?

Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA), the beholder of divine knowledge explains the structure of human conscious as, "Human conscious is well aware of happiness and remorse since the beginning. He always desires to identify the source of happiness and remorse; so that he can shield himself against the remorse and sustain the happiness forever. He never wanted to leave happiness, which in turn induces in him fear."(Loh o Qalam)

We mentioned above, a man is nothing but a thought. His thoughts are mostly focused on sustaining source of happiness. To ensure his ultimate objective, he acts. His actions are always an outcome of his choices. His choices are not emerged by him, they are there—an outcome of circumstance. He chooses one option (like one from MCQ) and apparently moves on.

Spiritual scientists are the beholder of divine knowledge or Qalandar conscious. They explicitly know that phenomenal world is merely a projection or illusion—an outcome of *ghaib* & *hazir*. There is only one agency who has the ownership. This tendency of detachment can only be achieved by nearness to the beholders of divine knowledge or spiritual scientists.

A man can never overcome the outcome of circumstances. Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) said, "A man can confide on his abilities, but can never relieve himself from the state of happiness or remorse. However, a faith in *ghaib* brings in him hope for the best. A faith in *ghaib* means—*ghaib* is at the mercy of a kind agency."

Ironically, people in general bond themselves mostly in diminutive agencies (source of hopes) for example, employer, parents, husband, wife, children, health, wealth, and social circles. He entangles himself in diminutive hopes, and consider them the only source of his betterment.

God said, "Those well-grounded in knowledge say: :We believe therein; all is from our Lord.." (Quran, 3:7)

which benefits men, and in the water God sent down from the sky, then revived with it the earth after it was dead, and in every creature He has scattered on it." (Quran, 2:164)

Spiritual scientists always insist on the understanding of underlying laws behind the concealed or phenomenal world. In context of aforementioned verse, one may ask:

* What is the methodology of sowing seed in soil? Why does not a dry land turn out to be fertilized for a seed?
* What are the principles behind the sailing ships and boats in ocean?
* What is the mechanism behind the periodic formation of days and night?
* What does the term 'benefit' means? (in context of divine wisdom)

A deep contemplation into the natural phenomenon reveals laws of creation. Conscious learning plays key role in the successive understanding of natural laws. Spiritual scientists mentioned role of various types of conscious in learning.

Spiritual scientists highlight the role of 'thought' in observations or experiences made for any matter, non-matter, and revealed or concealed objects. They train their thoughts. Thought is activated according to tendency or inclination of an individual. Therefore tendency drives thought to achieve objectives. Our tendencies or inclinations in general are spatio-temporal dependent while awake and spatio-temporal independent while asleep.

Our conscious is an accumulated outcome of cognition evolved over the generations since its primitive age. We learn from parents, society, or at school to name a few.

For instance, our mother teaches us etiquettes of eating, drinking, sneezing, talking, etc. It may be worth to mention these etiquettes are associated with utilization of material objects. They do not provide any assistance in addressing any issue to deal with situations beyond the phenomenal world (for example a world we experience during sleep) and so on.

The confusion reigns due to ambiguous understanding of even phenomenal world. For example, biochemists describe the chemical composition of an average seventy five kilogram human consisting of eighteen kilograms of carbon, few canes of nitrogen, fifty kilograms of water, phosphorous enough to prepare two thousand sticks of a match, an ordinary iron nail and few other elements.

One can imagine well, if we gather aforementioned elements with the help of some unknown mechanism, would we be able to obtain an alive human? The stoichiometry of human being does not reveal the intricacy of bearing

entists believe that laws of nature are neither changed nor receded. Nature continues to vitalize every unit of phenomenal world at any instant or fraction of time. At every moment, beings are transformed into another moment. A moment dies into another moment. A physical phenomenon is an outcome of spatio-temporal transformation. Whatever became past, or holding in present or would become future is an outcome of spatio-temporal transformation. The trinity of outcomes differ in proportions of constituents. These proportions maintain the mechanism of appearance of an object from concealed world. In other words a phenomenon is expressed in a concealed world, then apparent world followed by again concealed world. In divine knowledge, the mechanism of conceal and reveal is termed as *ghaib* and *hazir*. The nature provides all resources to a phenomenon for being in *ghaib* following by *hazir* in physical world.

This elaborates the following facts:

- The dry land at the Earth dies or transforms after ten thousand years like other beings' life cycle. Same is true for the oceans that is oceans go through the cycle of birth and death.
- All beings continue to live through the cycle of life and death.
- Like any living being, Earth is enmeshed for the vitality of not only herself but all inhabitants.
- The mechanism of birth and transportation of water, oil, metals, diesel and all other inhabitants in various Earth's tablets is also described.

The divine law behind the contemplation in natural phenomenon is narrated by Mr. Azeemi as, "God reveals multiple options to an individual, who seeks towards Him".

In line with their tendency, the followers of materialism or pedantic knowledge-seeking methodology restrict themselves to only the material composition attributed to the phenomenal world. It is an essential reason behind their limited viewpoint in seeking for truth behind any natural phenomenon. Scientific knowledge is told as an outcome of observation and experience. Scientists ignore the role of thought in the conclusion. It is thought that reveals or intrigues to invent, but the true nature of thought is still considered as myth among the contemporary methodologies of science. Unlike conventional cognition process, spiritual scientists focus on the growth of 'thought'.

It is mentioned in last holy book as,

"Surely, in the creation of heavens and earth, and the alternation of night and day, and the ships that sail in the sea, carrying that

The Cycle of Life

The artifacts and sea shells found in Tibet indicate that it was in oceans. Can a naïve person conclude, Mount Himalaya was the part of ocean and Tibet was at its coastal areas?

Spiritual scientists mentioned that dry land and oceans on the surface of Earth swap each other after every ten thousand years. It is indicated in the Holocene cycle, the periodicity of the event varies between ten to eleven thousand years. The unprecedented climatic changes include eruption of volcanos, movement of rocks at the ocean bed, strange behavior in underground magma, rise in frequency of tsunami occurrence and ever increasing rate of ice glacier melt at the arctic poles.

The impact of climate economics not only changes the shape of Earth's surface, but also wipes out the traces of technology boom and civilization inhabited at Earth. Contemporary science and technology seminars, scholar's consortium and their research articles are questioning the gravity of consequences due to drastic climate change which is falsely portrayed to a commoner.

- The avalanche melting trend on the glaciers of Antarctica would continue, as it is since 1980, till 2012?
- What would be the outcomes of glacier melting at the South Pole? The journals of NASA indicate the raising ocean water levels around South Africa and Australia. The speed of melting of these glaciers is equivalent to speed of train moving at one hundred kilometer per hour.
- The artifacts and sea shells found in Tibet indicate that it was in oceans. Can a naïve person conclude, Mount Himalaya was the part of ocean and Tibet was at its coastal areas?

It is worth to have an overview of geological changes that are accelerated since the year 2006.

- Existing dry land and oceans at our Earth swap their locations. Inhabitants begin their lives from caves and trees.
- The impression of experiences made in either states of sleep or awakening are similar.
- A man is nothing but an expression of thoughts.
- The motility of life is an outcome of orbital and longitudinal rotation. For example rotation of wheels in a vehicle, translate its displacement in longitudinal motion.
- The illuminated light plays a key role in the observation of objects.

Contemporary science recognizes the vital force behind the phenomenal world as nature. Sci-

few minutes passed by and he heard the gentle trickle of water dripping from a tap in the garden outside. He rushed to the master and asked again to which the master replied in the negative.

This went on for many days. He heard the crickets in the grass, the birds chirping, the winds howling, the movement of the curtains and more. Yet the master kept saying "No." And would encourage him to not to give up.

One year had passed by. And then the boy disappeared. He had stopped coming to the master. The master went out looking for the boy and one day found him sitting below a tree in perfect stillness. The master not wanting to disturb him, sat besides him and watched hours go by.

The sun was setting and the boy gently opened his eyes and was pleasantly surprised to see the master sitting before him.

"Did you hear the sound of clapping with one hand my dear boy?" the master asked.

The boy smiled and said, "Yes my dear master. I finally found the sound of silence within me."

The master hugged the boy tight. The seed of silence had sprouted into a sapling within the boy. It was only time before it would grow into a mighty tree and benefit all around it.

We are so engrossed in the sounds in this world that it keeps us distracted. And eventually we are so used to being surrounded by noise that we forget to focus on the silence within it.

Most of the growth that happens in the world is in silence within the sound. We never hear a seed crack open into a plant. We never hear the sound of a bud blooming into a flower. We neither hear the sound of the clouds moving, nor hear the sound of the fruit ripening on the tree. We don't hear the sound of the plant breathing, birds talking, and the sound of the blood rushing in our body is ignored too.

Why don't we hear these sounds? And if we do not hear them, does it mean they do not exist?

The sounds do exist but we cannot hear them, as we do not quiet ourselves. We have not trained our inner ears to grasp the sounds within the zones of silence. The insects, animals, fish hear decibels of sound that we cannot hear, this is proof that there are many layers of sound. With daily practice of meditation, we will discover new things within and around us.

"Nature reaches out to us with welcoming arms, and bids us enjoy her beauty; but we dread her silence and rush into the crowded cities, there to huddle like sheep fleeing from a ferocious wolf."

—Khalil Jibran

The Art of Meditation

The master hugged the boy tight. The seed of silence had sprouted into a sapling within the boy. It was only time before it would grow into a mighty tree and benefit all around it.

A young lad about seven years old lived around the residence of a Sufi master. It was his routine to visit the master every morning before he left for school and also in the evening once he was done with his schoolwork. He would always watch many hundreds of people come to the master to seek answers, help, solutions, guidance, etc. The boy was so fascinated to see that many people lightly bowed to the master in reverence and gratitude.

One day, he was so tempted to be like the others that he went forward and began to bow before the master like he had seen the adults doing. The master began to smile knowing that the child was imitating the elders and bowed back in acknowledgment.

The boy sat in silence till the entire crowd left and then gently looked up at the old saint. The master called him forward and asked lovingly, "What happened today? Why are you here?"

The boy had heard many of the seekers ask the question, so he asked too, "I have come in search of truth."

The master smiled and called him even closer, "Well, that is very good. What do you want me to help you with?"

The boy now excited, asked again what he had heard the elders ask, "What can I do to find my truth?"

The master knew that the child was simply imitating the others but knowing that it is the right time to train the child, he said, "I am sure you have heard the sound of two hands clapping, now can you come back and tell me what is the sound of one hand clapping? Go inside and start meditating dear boy, I am sure you will succeed."

The boy bowed down lightly again and left to the meditation hall. He watched all around him sitting still with their eyes closed and he imitated them. A few minutes passed by and suddenly far in a distance he heard the sound of a lady singing devotional songs. He opened his eyes and rushed to the master and asked, "I think I found the sound of one hand clapping. It sounds like a lady singing. Am I right?"

"No this is wrong. It is okay meditate tomorrow again and let me know." Said the saint.

The boy came back again the next day and sat in the meditation hall with the others. Yet again a

chopped off. Then the pot is taken off the tree and is kept under its shade.

The plant now has two branches – one from its own seed and the other from the continuation of the tree it was attached to (akin to a Sufi order). Now there is a struggle between *you* and *I*.

With the gardener's special attention, the branch of the original seed is cut off and plant is left with only the two leaves of the grafted tree's branch.

Now that the original branch has been chopped off, no one will call this plant with its original breed name. If the gardener does not transform it in this way, the grafted tree's branch dries out and the plant will remain the one grown from the original seed. Even if this plant firmly roots itself in the earth, its fruits are sour, and contain only seed and fibre – with no aroma or juice.

If the gardener wants to make use of the grafted tree branch, they remove the branch of the original seed, hence the '*I*' (ego) is removed. After that, the pot is broken and removed from the tender shade. Then the plant is planted and its sand mixes with the sand of the earth. This is like the establishment of the disciple.

The plant has to face the scorching heat of the sun and storms. With the blessings of God, the plant absorbs the sun's rays, attains power from the soil, and is nourished with provisions of life and refreshment from the rain, all helping it to grow - Allah Hu, Allah Hu.

> Everyone wants rest and runs towards it, thinking that they may find it in one thing or another. A hungry person runs towards food, a thirsty person towards water, and a lover towards a loved one, but food, water, or loved ones are not at rest. Only God is at rest! It is indispensable that the creations will naturally turn towards Him.

Gardeners who are farsighted remove the flowers of the initial two to four cultivations so that they don't bear fruit. This is because fruits of an early age are tasteless, and lack energy.

When these trees become shady and strong enough to deal with storms, then both the owner of the garden and the gardener feel happy that it was planted by them. The tree will now give more fruit that look magnificent, taste great, and will be very light and sweet smelling. Its mangoes are not easy to digest, but they are very healthy and full of nutrients. This is what it means by *mureedi* (being a disciple). As for what *peeri* (spiritual mentoring) is, I will let you know some time later."

(Episode 2)

V

cliff. When they got closer, they saw a six feet dead cobra with some hair on its head. Blood was found scattered around the cliff too. It appeared that the snake gave its life by banging its head on the cliff, and failed to reach the boy. At that time, Baba Qadir (RA) came out of his hut, casually looked at the snake and said to the Raja and his spouse, “Take your boy, he will be happy.”

-·✻·-

Baba Qadir Auliya (RA) says, “There is nothing in the universe at rest. Everything is restless, whether it is a human being, or anything else – quadrupeds, birds, the Earth, heavens, mountains or rivers. Everyone wants rest and runs towards it, thinking that they may find it in one thing or another. A hungry person runs towards food, a thirsty person towards water, and a lover towards a loved one, but food, water, or loved ones are not at rest. Only God is at rest! It is indispensable that the creations will naturally turn towards Him. It is mentioned in the holy Quran that, ‘Everything is from God and returns to Him.’”

Dear readers, the pathways to God’s blessings open through patience and trust in God. The excuses of the ego create hindrances. However, God opens His paths to those who trust in Him and strive to cognise Him. The Avenue of *Sirat-e-Mustaqeem* (the Straight Path) opens up, and one enters into the state of *Nafs al -Mutmainna* (the peaceful inner self).

"O content soul, come back to your Lord, well pleased, well-pleasing. So, enter among my servants, and enter My paradise.” (Quran, 89:27-30)

-·✻·-

In an account of the year 1951, it is recorded that a disciple asked Baba Qadir (RA), “What is *mureedi* (being a spiritual student)?”

He replied, “Have you ever seen the nurturing of mango trees that are produced through the technique of grafting? A mango seed is taken, irrespective of its type and it is sown in a pot. After a year or two, when the plant grows to a cubit’s length, it is hanged on a mango tree, irrespective of its breed. With a dagger, the little plant is pierced; It feels the pain and sheds tears too.

A similar gap is pierced into the tree’s branch, and both slit parts in plant and tree are bandaged together with the help of a cloth in a manner that the marks on both are allied. Some mud is applied on it that is kept wet daily with water. By doing this, the plant stays under the shade of the tree for a little while.

Then the part that is attached to the tree is detached from it when two new leaves appear on the branch. At that point, the plant from the pot does not feel pain, but the tree does, as if its finger is

follows:

"Thoughts of the beloved has overwhelmed me

The wine of divine light is falling down

Who would desire any other wine

When Joy exists without it

In the wonderful city of the heart

If the new moon of concentration appears

Then in these waves of the divine light

Drinking (the divine drink) has become worship

There are some beautiful dreams

There are some sweet words and talks

There are such visions

For which the eyes of a pious person yearn

There is no beginning and there is no end

There is no association between body and soul here

The shadow of the Loved One is casted here

There is no death or life here

I have forgotten all sorrows

All temples of happiness are broken

Only by praying in Your name

the abode of the heart is a home"

-·※·-

A Raja had only one son. When he was born, pandits predicted that at the age of 21, the boy would die from the bite of a black cobra, and that no matter what was done to protect him, whether he was kept in the castle surrounded by water or in a fort with walls made of fire, the calamity would befall, and the boy would not survive. The Raja did whatever he could to seek help and went to everyone he thought could help, however, everyone apologised and said that they could not.

When the boy was to turn 21, someone mentioned Baba Qadir (RA) to the Raja. He and his spouse took their son to Baba Qadir (RA) and when Baba Qadir (RA) heard the matter, he said, "It will happen."

They didn't get the answer they wanted and returned hopelessly. On the boy's 21st birthday, his parents took the boy to Baba Qadir (RA) again, who was staying at a place that was habituated by dangerous snakes. They left the boy there and said, "Please take care of what happens to him, we will take his body in the morning."

Baba Qadir (RA) sent a helper to town to bring five lanterns and some books for the boy. As the night grew, Baba Qadir (RA) placed four lanterns on each corner of the cliff and one in the hut where the boy was staying. Baba Qadir (RA) went to the boy and said, "You will not be able to sleep, so try reading books and stories to pass the time."

In the early morning, the boy's parents came over to take his body, but saw him strolling on the

fragrance in comparison to this *tasbeeh*." Baba Qadir (RA) then focused on the *tasbeeh* for a little while and gave it a good rub.

He moved his palms towards the people around him and asked, "How is the fragrance?" It was of Agarwood. He gave them the *tasbeeh* to smell, and it also had the fragrance of Agarwood.

He said, "I had eight to ten *tasbeeh* but the Brahmins took them from me one by one."

The beloved disciple of Baba Qadir (RA), Hazrat Ubayd Allah Durrani (RA), explained the aforementioned account in the following words:

"Each word is filled with wisdom. I may explain a little, just for a reference. Baba Qadir (RA) compares the euphoria of love to wine. It has passion and ups and downs, and when it touches the soul, serenity is experienced. It liberates them from all states of mind and the level of ecstasy surges high. This is the impact of the wine. Neither the poison of a snake nor any medicine works on a person in whose blood this black opium penetrates. It intoxicates, but it doesn't cause any adverse impact. It does not allow spiritual powers to disintegrate and establishes a permanent connection with '*Hu, Hu, Allah Hu*'.

"Coffee: The red bunches signify the unity of the *ummah* (the people of Islam), and the '*Kut Kut'* sound is the remembrance of God in the machine that is our body. These are presented to a pious person for evaluation, and after a little heat, or spiritual exercises and crushing, these people are made capable of serving the creations of God."

"Sandalwood: Just as the lion and elephant are kings of the animal kingdom, the Sandalwood tree is the king of the plant kingdom. It is soft yet very strong. Its scent, euphoria and beauty remain for an eternity. This is a reward that is specifically given only to the friends of God. I am not sure what he meant by the eight Sandalwood trees, and the rosary of Agarwood."

-·※·-

The secrets of the *ghaib* (unseen) are not unveiled due to one's desire or efforts. It is a blessing of God and He bestows to those who strive in His path. When a person shuns their ego and their heart purifies, they see the past, present and future all at one point.

Baba Qadir Auliya (RA) says, "Even if there is a matchstick in your heart, it will not catch fire unless it is rubbed. The fire can be produced if wood is rubbed against more wood, but it is not possible with each matchstick. This rubbing is done through spiritual exercises to annihilate the ego. The inner illumines and the unseen unveils."

Rehman Baba (RA), a disciple, wrote couplets in love of his spiritual mentor. Its translation is as

cerity. This poor animal can recognise its master in every condition by their smell alone. It considers itself a protector of its master and feels proud of it. It has no home, but once it comes under the care of someone, it never leaves, regardless of how harshly it is treated – whether it is kept hungry or treated in anyway unkindly. It seems that it has only one desire: Not to be separated from its master."

-·※·-

Friends of God are very analytical. They contemplate on the most minor and intricate details. Once, people were eating a meal when some poppy seeds were sprinkled over a dish. Baba Qadir (RA) said, "See how small the poppy seed is. It is a seed from the opium plant and their fields are found towards Bilaspur. There is an iron net around the fields and armed police guard it. Only those who eat opium work there. They feel very happy and exhilarated whilst doing it. They scratch the fruit with iron nails and collect its dried milk."

He then shared an event from 1927 when he went to Ananthagiri. He said, "There was an Anglo-Indian coffee contractor whose name was Kalay Shah. He showed us the orchards and the factory. The coffee plant resides under the shade of Silver Oak Tree. It has white leaves and red fruit. People living in mountains collect its fruit, and pile them up to sun dry it. Then they are cooked and are put through a funnel feeding into a big machine. This machine is operated manually rather than using an ox or any other animal. The 'kut kut' sound that is produced by it is heard at quite a distance. The machine separates the shells and beans. Its shells are harder than bones. The beans are green in colour and do not require any further processing as they are ready. Thus, they are put into bags and parcelled to Vizianagaram on ox carts, where they are checked, weighed and crushed into coffee powder."

He then said, "There were eight Sandalwood trees around the field and none of them had been chopped down. Inside the jungle there were more than 10,000 Sandalwood trees that were managed by the government. Kalay Shah asked the person living in the mountains to chop a certain tree and bring it along with its roots. People who lived there knew which trees contained fragrance. The person brought a tree to Kalay Shah as requested. Its trunk was just a little short of a cubit. It had three thick roots, and the smaller ones had been removed. These three roots were tied around the trunk using grass from the jungle and were placed in our car. Raw Sandalwood has a lot of fragrance."

While telling the story, Baba Qadir (RA) asked someone to bring a *tasbeeh* (rosary) from his room and said, "The raw Sandalwood doesn't have much of a

The Life of Baba Qadir (RA)

The secrets of the ghaib (unseen) are not unveiled due to one's desire or efforts. It is a blessing of God and He bestows to those who strive in His path. When a person shuns their ego and their heart purifies, they see the past, present and future all at one point.

There was a garden about half a mile away from the residence of Baba Qadir (RA), when he stayed at Metay. There was a coconut tree beside a well in the garden. In 1922, he looked at the coconut tree and asked the gardener, "Why are there no branches in this tree?" The gardener replied, "Baba – has there ever been a coconut tree with branches?"

Baba Qadir (RA) replied, "Why not? You will see, branches will appear in this tree."

The gardener kept quiet and did not say anything else. After 15 days, he came to Baba Qadir (RA) and said, "You told me that the branches would shoot out from this tree. Instead, it is dying. All of the leaves have closed like a cabbage."

Baba Qadir (RA) closed his eyes for a couple of moments and said, "Keep watching."

The gardener returned after two months and informed Baba Qadir (RA) that twin branches had grown from the coconut tree. It has been mentioned in the book '*Hayat-e-Qadir*' as,

"This tree still exists today. It has a trunk about 15 feet high, and on top exists the two branches that appear like two arms that further extend in an upwards direction. Both branches produce a lot of fruit. Unlike other trees who produce green coloured fruits, the fruit bore by this tree is golden in colour, like the rays of a setting sun. The outer skin of the fruit is thin, and on the inside, it contains sweet water and kernel.

How is it possible for everyone to attain its fruit? For those who are destined, they do receive it. The coconut has a specific meaning for the holy people – the *faqir*. It would not be a surprise if old, childless people came here with the wish of having children, and were subsequently blessed."

-·※·-

Baba Qadir (RA) used to take a great care of animals. One day, he was playing with a little dog. Someone there disliked the act, but did not express it out loud.

Through the inner light, Baba Qadir (RA) felt this and said, "See, the dog is a putrid animal. We offer prayers and always remain clean, and play with it too. What difference does it make? It is the fact that we are humans and they are animals. It is a sincere animal created from the soil of the navel of *aadmi* (man). Humans should at least have the same sin-

ror and put itself in the service of mankind. I felt I was serving my Lord God through the experience of being an unseen best friend to the humans.

Whilst all of this happened, I was also being transformed in a secret space within an oyster. One day, I felt my self being ejected from it. I saw the hand of a man that held me tremble in happiness at my sight. His eyes shone in delight as he called out to all around him. Apparently he had found a very precious and unique pearl that was, me. I had from a grain of sand become a priceless pearl. I looked down at the oyster; it had sacrificed its life in delivering a grain of sand as a precious pearl to the world.

I was set within the confines of a cold metal and the man presented me as an ornament to a very beautiful and kind woman who wore me around her neck. He made me a gesture of his love for her. She felt I made her look beautiful. I had managed to bring in happiness and love in their eyes. She then decided to have a look at herself in the mirror and there I was before her as the mirror and also on her neck as the pearl.

From that moment on I was both, the image and the reflection. It was I on both sides of the world. I was the one who saw and I was also the sight I saw. As a tangible pearl I strung close to human hearts and tried to make them happy and remain in love. As an invisible best friend in the mirror, I reflected their joy and fears and helped them transform. I thanked the ocean for making me experience both the seen and the unseen.

Awareness slowly began to set in and I began to reminisce on my journey.

The pearl = Physical body

The mirror = Screen of life

The grain of sand within the mirror = Soul

The Reflection = Soul seeing itself

The Ocean (Water) = Base of life

I exist as the body standing before the screen of life and at the same time I exist as the soul reflecting from behind the screen.

The physical body sees nothing but what the soul wants to show it. The physical body sees itself only from the eye of the soul.

I, a grain of sand mixed with water become everything and everyone. And when time lapses, no matter what shape one transpires into, they go back to being the grain of sand and water once again.

Finally, one day after many years, the mirror shattered and the pearl dissolved. A wind blew my fragments back to the shore and there I saw her, my dear ocean welcoming me with open arms. Once more, I, the grain of sand embraced my base in the ocean of life. And just as I dived back into the ocean, I glanced back to see yet another a young grain of sand entering an oyster and being laid on the shore. Life is cyclical.

“From Him we all come, and to Him we all return”

evening, I would cool down. It was fun to watch the dynamic relationships between humans. They were fun loving and built castles with me, some sat next to me and shed tears of pain as somehow the sandy beach was therapeutic for them. I also saw them play, tossing me over each other and giggling. Then there were romantics who drew figures upon me and expressed their love for each other. Some even pounded upon me in anger and frustration. I was learning a lot from my observations.

Just as I was getting comfortable and enjoying the fun and frolic on the beach, I was picked up by a seemingly nice gentleman and was filled into a bag. I knew I was being transported. But where, I did not know. I found him pouring me out from the bag into a vessel that seemed to be thick and strong. Before I could comprehend my situation, he added fine granules of certain elements and then kept me under a continuous blast of fire. The heat took me by shock.

I had never endured pain like that before. I was not sure, what was being done with me. I began to melt down completely and was no more a grain of sand. The heat had converted me into a sparkling, shining, transparent glass! I was then coated further with more elements until eventually, the man who transformed me placed me leaning against a wall, and looked into me. It was the most inexplicable moment of my life.

The man looked at me, but what he saw was actually how I saw him. He called me a mirror. I was able to reflect what I saw of them through me back into their eyes. I was taken home by another man and was placed on a pretty wall. I wondered what mundane life I would experience hung up on a wall as a mirror. But I was wrong.

I reflected not just the physical appearance of people, but if they looked with focused attention, I reflected their feelings, emotions, and intimate secrets. I showed them the creases of time on their bodies as wrinkles and grey hair formed. They found it easy to talk to me. They thought they were speaking to themselves, but I knew they were speaking to their reflection within me.

By being a mirror, I had been given an opportunity to befriend humans. Every time someone wanted to reflect upon themselves, they stood before me, baring their scars, pain, happiness, nervousness, stress, excitement, embarrassment and so much more. Some stood before me and rehearsed until I reflected back to them their confidence. Some stood before me and dressed themselves up until I reflected back to them their beauty. Some cried their eyes out before me until I reflected a smile back to them. I reflected their experiences. I reflected the changes within them. I even at times reflected their dreams, and they could see who they wanted to be in the times to come. I was their best friend.

I was a mirror to them. But to me, I was a grain of sand, which had transformed itself into a mir-

continued to grow. I began to nurture a deep desire to be around them. I had spent thousands of years in the ocean. “Would I meet the humans anytime soon?” I thought, and decided to ask the ocean herself.

Holding me in her arms she seemed to be in the right mood to answer my questions. “How do you let the land confine you?” I asked. “Do you not feel like showing your power over it? After all, you are 75% of the earth and the land is only 25%!”

The ocean playfully threw me over a few shallow waves before she caught me back into her arms and replied, “The land was birthed out of me. I occupied the space where the land stands today and then one day, out of my womb and by the will of God, this land was born.”

“How can I clash with whom I have given birth to? And who says I am not on the land? I am on the land as much as I am in the ocean. Everything and everyone on earth is made up of water. Do you see the clouds above you? They have droplets of me in them. Do you see the showers of rain? It is me who showers upon myself. Do you see the palm trees on my shores? The fruits have the sweetest form of my water within them. Do you see the supreme creation of God, called humans? Their bodies are also 70% water! There is nothing and no one who lives without me flowing in them. So waging a war with them is like fighting myself in all of them. I am everywhere and in everyone.”

I could feel the love of the ocean for all around her. She seemed to be the womb of all that was on earth.

I mustered the courage to ask her if I could live my life around the magnificent creation of God for a while, if I could live with humans. I expressed my desire to know them from close quarters. She smiled and said, “I will break you into two fragments. I will place one part of you inside the womb of a secretive little creature called the oyster. And the other fragment of you I shall place on my shore. You will see the dimensions of mankind that will help you understand them better. You will not be you. You will be transformed and through this transformation you will gain a deeper awareness about yourself. And when it is time, you will return to being a grain of sand again and come back into my embrace.”

Before I could say my goodbye, I found a part of me embedded in the womb of an oyster and in the next moment, another part of me was on the shore of the ocean. I was excited and could not wait to see what was in store for me. One part of me lay out in the open on the shore, ready for transformation, and the other part of me was hidden and transforming secretly.

The first great experience of being on land (which they called a beach) was my encounter with a bright form of light. The sun shone down upon me directly and at times I would see the feet of humans scorched by the hot sand (me). As the sun went down in the

The Grain of Sand

"...And when time lapses, no matter what shape one transpires into, they go back to being the grain of sand and water once again."

I am a grain of sand. I remember resting on the ocean bed. I loved the stillness around me. The ocean's water was cold and dark, yet there was a certain comfort she gave me within her incomprehensibility. The word 'mystic' is most apt to describe her personality. Under her waters, I bore witness to the most magical life.

With life in the ocean, one can never feel lonely as one is constantly surrounded by innumerable sea creatures; some were friendly, some shy, some were ferocious, and then there were others.

I loved watching the colourful schools of fish swimming over me. At times I felt myself floating up a little higher in the water before I settled back down again as the fish tugged at the seaweeds near me. I had witnessed many a tug of war between the fish and the colourful algae.

I cannot say that I was ever stationed at just one place during my stay at the bottom of the ocean. I moved from one end of the ocean to the other in my thousands of years of existence. Time for me was a concept aligned to the current of the water. When the ocean was still, time seemed to have stopped. But when the ocean was rejoicing in her power, time flew by in the blink of an eye. I have surfed waves, dived deep into the depths and have enjoyed every level of the ocean, learning so much from her in the process.

There were months that I would just see myself settled and rested and then there were times where I was hurled around and taken on a ride across the world. I have witnessed the deepest secrets and priced treasures hidden within the ocean's bosom.

The ocean has always known that she occupies 75% of this earth and yet she has never engulfed the 25% of the land around her or tried to threaten it with her powerful existence. I learnt this trait of humility from the ocean. As mighty as the ocean is, she was comfortable being confined by the borders of the land that she could very easily overpower.

I have strongly felt the maternal instinct in the waters. She nurtures the life force that lives within her; be it the tiniest of sea creature to the largest mammal on earth, the whale. I have also seen her kissing the feet of this beautiful creature called man as he stood embracing and playing in her waves.

I remember the first time my eyes met this beautiful creation of God, which the creatures of the ocean referred to as humans. The ocean seemed to be at her playful best when she saw how much the humans loved to explore the adventure within her.

My curiosity about humans

be explained through the process of breathing. When an individual inhales, the act of inhalation gives birth to space and the pace of breathing is called, time. If the cycle of breathing breaks in between, time will not manifest for that individual. Here, the question arises: if movement is considered time, then what is time?

Prophet Muhammad (PBUH) says, "God and I are companions in time."

God says,

> "There has come upon a period of time in which he was nothing worth mentioning. We have created man from a mixed sperm-drop to put him to test; then We made him able to hear, able to see. We have shown him the way to be either grateful or ungrateful."
>
> (Quran, 75:1-3)

When God decides to manifest anything, He commands, "Be!" and it becomes. Thus, time is the will of God, and the will of God states that an individual should spend their life with gratitude through thick and thin.

Life is defined as movement, and it is projected in all the things we do, such as, eating, sleeping, standing, walking, talking, blinking, and thinking. It propels an individual to muse over what movement is, from where it comes and how it is perceived, manifested, and to where it eventually disappears.

> "He is the first and the last, and the manifest and the hidden, and He is all knowing about everything. He is the one who created the heavens and the earth in six days, then He positioned Himself on the Throne. He knows whatever goes into the earth, and whatever comes out from it, and whatever descends from the sky, and whatever ascends thereto. He is with you wherever you are, and God is watchful of whatever you do. To Him belongs the kingdom of the heavens and the earth, and to God all matters are returned." (Quran, 76:3-5)

Dear readers, the Quran says, "God is with you, wherever you are, and He is watchful of whatever you do."

In the 'Message of the Day', movement is explained through various angles. Read it with concentration and contemplate. By the will of God, this exercise will help your minds soar into new horizons. If you find difficulty in comprehending any part of the article, you may write to us.

May God protect you.

The duration of these phases is called Time.

Dear readers, please read the underlined paragraph more than once. Write down whatever these lines have inspired you in points and number them. Once done, phrase them together and read it thoroughly. By the will of God, the wisdom hidden within it will dawn upon you.

Movement comes from a source, which after driving life returns to its place of origin. When an object moves, a force from the opposite direction resists it. Without this resistance, an object or body will enter into a new zone. For example, in the case of the Bermuda Triangle, the material body disappears into it for it cannot resist its magnetism.

Another example is that of a spinning top. When it is thrown on to the ground, it tries to enter into it. But the force of earth pushes it outward. These forces of attraction and repulsion are responsible for the spinning top staying on the surface of the earth. If the force of the earth did not repel it, the spinning top would enter into another zone.

The law of movement is established on the forces of attraction and repulsion. It applies in the mechanics of every entity. For example, the contraction and expansion of the heart is driven by the forces of attraction and repulsion respectively. Another example is the repulsion of night is day and vice versa. If this law did not exist between the two, the day and night would merge into each other and become extinct.

Movement can also be called speed. It is the speed that formulates classifications between entities. Speed can be defined as energy. When energy travels inwards, it is repelled by the inner space. If this action does not take place, one would not be able to describe speed. Likewise, movement is only believed to be a movement when forces are applied against each other. The invisible entity that propels the force is called 'space'.

Example: When an individual walks, their feet push the ground backwards and the ground in turn pushes them forward. Once one lifts their leg, the weight of the leg shifts into a void and becomes free from gravitational forces to a certain extent. But in the very next moment, gravity pulls the leg back on to the ground, and the person moves forward and takes another step.

It is speed that helps us determine the pace of movement, and this can

The sperm is the initial stage of a physical body, be it in animals, mountains or plants. And like everything else, it transpires into three forms.
1. Gas 2. Liquid 3. Solid

Primarily, a sperm is in a gaseous state. After the increase in energy, the gas turns into liquid, and then changes into a solid form after it takes root inside the womb. This is how everything grows. This process is reversed when the body is buried after death. After a lapse of time, the dead body in the grave vanishes, leaving behind clay.

> "We have created man from an extract of clay. Then we made him a sperm-drop in a firm resting place. Then we turned the sperm-drop into a clot, then we turned the clot into a fetus-lump, then we turned the fetus lump into bones, then We clothed the bones with flesh; thereafter We developed it into another creature. So, glorious is God, the Best of the creators." (Quran, 23:12-14)

Water is a space that gives birth to plants, animals, mountains and everything else. Space denotes capacity and intermittence; it is the movement in the objects that alters their states as they step into one form or the other.

Example: A person sits with their feet parallel to each other. After a while they move and change their posture. Now these are two different ways of sitting down. Between these two states, there lies an intermittence, which we call space. But what is a space? Every posture, and the subsequent changes in them are considered as spaces, and their classification is established on movement.

In the beginning of the universe, God addressed the creations and said, "*Alastubirabbikum".* This command created an awareness of space in the beings. They heard the voice of God, witnessed Him, and acknowledged His sovereignty and rule in intervals. It reveals that all the senses are imbedded in '*Alastubirabbikum'* in entirety, but due to restricted consciousness, they were activated successively. The faculties of hearing, seeing, perceiving, and speaking are stages of space, and the space signifies the level of awareness. It is a common observation that some people grasp the meaning at the very first instance, and others need a detailed explanation to understand the same. They all comprehend the message, but the difference lies in the levels of their intellect and the time taken to understand.

Everything in the universe is transiting from one movement to another, and the lapse in which the movement occurs is called Time. A space is birthed out of another space as a child moves on in their life. Their birth, infancy, childhood, and young and old ages are all diverse spaces with distinct proportions. Hence, they do not overlap with each other.

Message of the Day

The movement of a body is in coherence with information, as it is information that steers life. For instance, innumerable provisions that lay beneath the earth rise to the surface after they receive information in the guise of rain. This display of resources demonstrates that everything within the earth is encased and is under a systematized motion. However, these resources remain latent to the consciousness until they are visible on the exterior surface.

Every existence on this planet begins from either a sperm or a seed. The seed inside the earth or a sperm inside a womb is a record of life. The sperm though invisible to the naked eye, contains an entire being within it. In the same manner, the record of a tree is embedded within a seed. Being in different planes of intellect, an enlightened soul observes the tree in a seed with all its components, whereas a common person tends to observe it only when the seed unfolds or there is expansion in its space and it enlarges. The Quran mentioned the record of life as follows:

> "And what may let you know what Sijjin is? A register inscribed." (Quran, 83:8-9)
>
> "And what may let you know what Illiyyun is? A register inscribed, attended by those who are blessed with nearness to God." (Quran, 83:19-21)
>
> "Surely God is the one who splits the grain and the date-stone. He brings forth the living from the dead, and He is the One who brings forth the dead from the living. That is God! To where, then, are you being turned away?" (Quran, 6:95)

Going back to the example of rain, when the message descends from the hidden realm to the consciousness, it manifests life on earth. That is because every existence has two folds. One facet lies on earth, and the other is in water that descends from sky. When both proportions merge, the object appears. Before rainfall, the information (movement) in water remains frozen and concealed in the clouds. At this point, the energy present within and around the cloud compress each other and result in the formation of a force. As this force generates heat, it melts the frozen water in the sky resulting in rainfall. This change in the space of water from gaseous form to solid and liquid is applicable to every creation in this universe.

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
The Grain of Sand	Bibi Anuradha (UAE)	168
The Life of Baba Qadir (RA)	Noor Jehan	164
The Art of Meditation	Roshan Sitara	158
The Cycle of Life	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	156
Prophet Solomon (PBUH)	Extracted	151
The Diary of Birds	Hazrat Farid al-Din Attar (RA)	147

"Do not be satisfied with stories, how things have gone with others. Unfold your own myth."

-Maulana Jalal al-Din Rumi (RA)

Vol 7 Issue 1 | February 2019 | Jumaada-al-Awal —1440AH Jumaad-al-Ukhra

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor
Khwaja Shams al-Din Azeemi

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.70/- Per issue. Annual subscription Rs.950/- with Reg. Post (Domestic), US$ 60/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020